جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

جلد ۴۴	خصوصی بخشی غلام محمد نمبر	شمارہ ۹_۱۰

نگراں:

ڈاکٹر رفیق مسعودی

مدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکرٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز

کمپوزنگ : اعجاز حسین بٹ، ڈل گیٹ، سرینگر

مطبع : میکاف پرنٹرس، نئی دہلی

شیرازہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں
اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی
یا ادارے کا کلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں
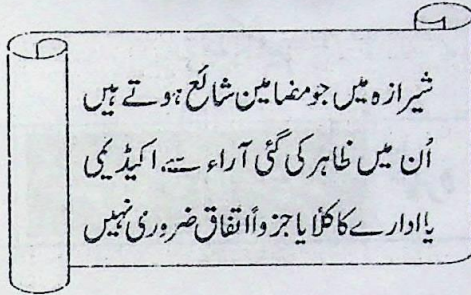
قیمت :- ۲۰/روپے
۳۰/روپے (مجلّد)

سرورق : جی۔احمد

خط وکتابت کا پتہ:

محمد اشرف ٹاک

ایڈیٹر شیرازہ اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز،
سرینگر/جموں

فہرست

عرضِ ناشر

اِس خوش بختی پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے کہ ہماری ثقافت کا اُمین اِدارہ کلچرل اکادمی اَپنے قیام کے پچاس برس پوُرے کر رہا ہے اور اِس سلسلے میں شادیانے کی تقریبات کا خاکہ ترتیب دیا جاچکا ہے۔ اِس پُر مسرت موقعے پر ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اَپنے اسلاف کو یاد کریں اور انہیں شایان شان خراج تحسین پیش کریں جنہوں نے اَکادمی کے قیام اور اِس کی پرداخت میں کلیدی رُول اَدا کیا۔ اِس سلسلے میں راقم نے جب اکادمی کے صدر اور وزیراعلیٰ جناب غلام نبی آزاد کی خدمت میں معروضات پیش کیں تو اُنہوں نے بلا کسی توقف ہدایت دی کہ اِس کارِ خیر کی ابتدا اکادمی کے بانی صدر اور تمدن شناس شخصیت مرحوم غلام محمد بخشی کی حیات اور کارناموں کو اُجاگر کرنے سے کی جائے۔

اَکادمی کی جشنِ زرّیں تقریبات کی شروعات کی اِس سے بہتر کوئی اور صورت نظر نہیں آئی کہ اُس شخصیت کی حیات اور کارناموں کو اُجاگر کرنے کیلئے شیرازہ کی اشاعتِ خصوصی کا اہتمام کیا جائے، جسکی مساعی جمیلہ سے اکادمی کا قیام عمل میں آگیا۔

خلوص کے ساگر اور دِل کے قلندر بخشی صاحب اَپنے اَندر پھولوں کی طرح مہکنے کا اَنداز رکھتے تھے۔ اُن کی ذات کے یہی صفات اُن کی تمدن شناسی میں بھی نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہر طور اُنہیں اِس نعمت سے نوازا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اُنہوں نے کِس طرح ثقافت اور تمدّن کے ساتھ اُپنی جذباتی وابستگی اور فکری پامَردی کا ثبوت دیا۔ ریاستی کلچرل اَکادمی نے گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں اُپنے وسیع

اشاعتی پروگرام کے ذریعے مختلف زبانوں میں ہزاروں کتابیں، رسائل اور جرائد منظر عام پر لائے ہیں جن میں بہت سی مقتدر ہستیوں پر خصوصی یادگاری شمارے بھی شامل ہیں۔ لیکن اکادمی اپنے بانی صدر مرحوم بخشی غلام محمد کی تمدن شناسی کو اُجاگر کرنے کیلئے کسی ایسی یادگاری اشاعت کا اہتمام نہیں کرسکی۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو...... دیر آید درست آید کے مصداق اکیڈیمی کو اَب یہ سعادت حاصل ہورہی ہے کہ اپنے موجودہ صدرِ محترم کی ہدایت پر اِس بھول کا ازالہ کرے۔

ہماری استدعا کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے جن محترم مقالہ نگاروں نے اِس اشاعتِ خصوصی کے لئے ہمیں اپنے التفات سے نوازا اُس کے لئے ہم اُن کے اِنتہائی ممنون ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اُن کے تعاون سے ہی ہماری یہ کوشش کامیاب ہوسکی ہے۔ مدیرِ شیرازہ، محمد اشرف ٹاک نے جس لگن اور محنت سے اِس اشاعتِ خصوصی کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے وہ لائقِ ستائش اور قابلِ تعریف ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی کے بانی صدر مرحوم بخشی غلام محمد کی تمدن شناسی کو اُجاگر کرنے کی اِس کوشش کی خاطر پذیرائی کی جائے گی تکہ ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ مل سکے۔

کوئی مثال آپ پیدا کر
کچھ نہیں دُوسری مثالوں میں

ڈاکٹر رفیق مسعودی

☆☆☆
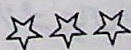
حرفِ آغاز

بخشی غلام محمد ...... ریاستی کلچرل اکادمی کے بانی صدر ...... اُن کی دُور اندیشی ، دُور بینی اور تمدن شناسی کی بدولت آج سے قریب نصف صدی قبل اکادمی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ آپ نے صرف اکادمی قائم کرنے کی رسماً ذمہ داری نہیں نبھائی بلکہ اِس کے خدوخال اور گیسو سنوارنے میں خاص اپنے دستِ شوق سے کام لے بعض قابلِ تقلید مثالیں قائم کیں۔ اپنے وقت کے سربرآوردہ ذی علم اور اصحابِ نظر کو چُن چُن کر اکادمی میں اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اِس اِدارے کے لئے مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ اکادمی کے پروگراموں میں اکثر خود شریک ہوکر اُن کی زینت بڑھاتے۔ اُن کے عہد میں اکادمی نے جو ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں انجام دیں وہ ہماری ثقافتی تواریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اُن کے ہی دَور میں مختلف

زبانوں میں رسائل اور جرائد کا اجراء کیا گیا جس میں شیرازہ اُردو بھی شامل ہے۔ کشمیری ڈِکشنری پروجیکٹ تشکیل دیا گیا۔ اَکادمی کی لائبریریاں قائم ہوئیں، شعبہ مخطوطات کی داغ بیل پڑگئی اور مختلف زبانوں میں صدیوں سے دَبے ہوئے دفینوں کی بازیافت کے لئے اِقدامات کئے گئے۔ بخشی صاحب کی ذاتی دلچسپی کے نتیجے میں اِنتہائی قلیل عرصے میں ریاستی کلچرل اَکادمی کا شمار ملک کے مقتدر اور باوقار علمی، اَدبی اور ثقافتی اِداروں میں ہونے لگا۔

ملک کا شاید ہی کوئی اَدیب، شاعر، فنکار یا دانشور ایسا ہوگا جو اکادمی کے چشمہ زُلال سے فیضیاب نہ ہُوا ہو۔ اَپنے وقت کی سربرآوردہ شخصیتیں اُن کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ اِس پورے خطے کی تہذیبی روایات اور ہمارے مشترکہ کلچرل ورثہ کی خصوصیات پراُن کی گہری نظر تھی۔ اردو زبان اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے جتنا انہماک اُن میں تھا ہندوستان کے دیگر عمائدین میں کچھ کم ہی نظر آتا تھا۔ اُن کے بارے میں اُن کے قریبی جانکار لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ علمدارِ کشمیر حضرت شیخ نورالدینؒ اور للِ عارفہ کے کلام کے عاشقِ صادق اور اُرنہ مال کے متوالے ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرِ کشمیر مہجور اور رسول میر کے شیدائی تھے۔ جس نے بخشی کو نہیں دیکھا وہ ایک بڑے اَدب نواز کی دِید سے محروم رہ گیا۔ رقص وموسیقی کے ساتھ بھی بخشی صاحب کو والہانہ کشش تھی، سِتار، سنطور اور ہارمونیم کی وُجد آور موسیقی سے آپ پر ایسی کیفیت طاری ہوجاتی کہ دنیا ومافیہا سے بے خبر

ہو جاتے۔ وزیرِ اعظم بن جانے کے بعد بھی بے پناہ مصروفیات کے باوجود آپ پابندی سے تمدّنی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔

ایسے دیدہ وَر اور تمدّن شناس شخصیت پر اُنکی حیات میں کئی رَسائل اور جرائد نے خصوصی نمبر شائع کئے لیکن اُن کی وفات کے بعد اِس پُرفریب دُنیا نے انہیں بہت کم یاد کیا۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو جس پر خامہ فرسائی تضیعِ اَوقات ہے لیکن اَب شیرازہ کو یہ سَعادت نصیب ہو رہی ہے کہ کلچرل اَکادمی کے بانی صدر اور تمدّن شناس شخصیت جناب بخشی غلام محمد کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ اُنہیں گلہائے عقیدت پیش کئے جائیں کیوں کہ قومیں اَپنے اَسلاف کے کارناموں، کامیابیوں، ناکامیوں اور کامرانیوں سے سبق حاصل کر کے حال کی کمزوریوں کو سُدھار کر مستقبل کی قندیلیں روشن کر کے آنے والی نسلوں کی رہنمائی کا فرض اَدا کرتی ہیں۔ اَپنے اسلاف کے کارناموں کا اعادہ قوموں کا سرمایہ ہوتا ہے اور تاریخ ساز شخصیتیں قومی زندگی میں لہُو کی مانند رَقصاں نظر آتی ہیں۔ اِس عمل سے ایسی شخصیات کی شناخت بھی مطلوب ہوتی ہے جو عوامی زاویۂ نگاہ سے داد و تحسین کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ مقصد ایک ہی ہے..... تمدّن شناسی.....!

طریقہ یہی ہے بحرِ محبت سے گذرنے کا
کہیں سے ڈُوب کر جانا، کہیں سے تیر کر جانا

بخشی صاحب کے متعلق یہ تاثر عام ہے کہ جس نے انہیں محض سیاسی رہنما کے رُوپ میں دیکھا ہے، فنکار کے ہمدم رُوپ میں نہیں دیکھا ہے وہ اُن کی شخصیت کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا۔ اُس نے صرف تصویر کا خاکہ دیکھا ہے،

رنگ نہیں دیکھے ہیں۔ پرائم منسٹر سے کہیں دلچسپ حبہ خاتون اور اُرنہ مال کا متوالا بخشی ہے۔ وہ بخشی جس نے لل عارفہ اور شیخ نورالدّین نورانیؒ کے تقدّس کو سینے میں جگہ دی ہے۔ جس کے انگ انگ میں مہجور کے نغموں کی مہک رچی ہوئی ہے۔ جس نے بخشی صاحب کو نہیں دیکھا، اُس نے ایک بہت بڑے اور حقیقی ادب شناس کو نہیں دیکھا۔ جن لوگوں کو اُن سے ملنے جلنے اور ان کے دَور میں گذر بسر کرنے کا موقعہ ملا ہے وہ اُن کی انتہائی غیر معمولی شخصیت کو بُھلا نہیں پائیں گے اور یہ بھی کہیں گے کہ ایسی خوبیوں والا شخص انہوں نے زندگی بھر نہیں دیکھا ہے۔

بخشی صاحب ایک خود ساختہ، پرداختہ یعنی Self Made شخص تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا آغاز بہت ہی نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں کیا۔ لیکن اپنی محنت، ارادے اور صلاحیتوں کی بدولت وہ آگے بڑھے۔ اُن کے بدترین نکتہ چیں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اُن میں کچھ ایسی صلاحیتیں ضرور تھیں جن کی بدولت وہ اپنے ہم عصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ آپ ایک ہمہ پہلو شخصیت تھے۔ ایک طرف اگر سنجیدہ اور متین نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ظرافت کی جھلکیاں اس سنجیدگی کو کم کرتی نظر آتی ہیں۔ اُن کی سخاوت، دوست نوازی اور دریادلی کی حکایات آج بھی زبان زدِ عام ہیں۔

ریاستی کلچرل اکادمی کے صدر دفتر میں بخشی صاحب سے وابستہ بہت سی یادیں محفوظ تھیں جن میں نادر و نایاب تصاویر، بخشی صاحب کے دستِ خاص کے Notes، دفتری مراسلت وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں لیکن

جون ۱۹۹۹ء میں اکادمی کی عمارت نذرِ آتش ہو جانے کی وجہ سے یہ گنج ہائے گرانمایہ چشم زدن میں راکھ کا ڈھیر بن گیا اور یوں اکادمی کے حوالے سے ہماری تمدنی تواریخ کے بعض اہم سنگ میل گمنامی کی نذر ہو گئے۔ اِسکے باوجود جو کچھ دستیاب ہو سکا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

اِدارہ جملہ مضمون نگاروں کا انتہائی مشکور ہے جنہوں نے ہماری گذارش پر اَپنی نگارشات سے ہمیں نوازا ہے۔ خاص طور سے شاعر، محقق، ناقد اور صحافی جناب غلام نبی خیالؔ کا بے حد مفید تعاون حاصل رہا۔ خیالؔ صاحب نے نہ صرف بخشی صاحب کے ساتھ اَپنے ذاتی مراسم پر مبنی ایک دلچسپ مقالہ ہمیں مرحمت فرمایا بلکہ اُپنے مالا مال ذاتی کتب خانے کو کھنگال کر ایسی نایاب نگارشات عطا کیں جو اَب تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ ہم محترم خیال صاحب کے مشکور و ممنون ہیں۔

اِس اشاعتِ خصوصی کیلئے ہم نے بہت سی ایسی شخصیات سے بخشی صاحب پر مضامین ارَسال کرنے کی گذارش کی تھی جن کو بخشی صاحب کے قریب رہنے کا موقعہ حاصل ہوا تھا لیکن طویل اِنتظار اور پیہم گذارشات کے باوجود ہم اُن کی نگاہِ کرم سے شرف یاب نہیں ہو سکے کہ بخشی صاحب کے زمانے سے لے کر آج تک جہلم میں کافی پانی بہہ چکا ہے اور وہ دُور ساحل پر بنے عافیت کدوں میں اسکی بیقرار لہروں کا نظارا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور یہاں تو حال یہ ہے۔

سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بے کراں کیلئے

مجبوراً ہمیں مختلف رسائل، جرائد اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع شدہ اُن مقالات اور تاثراتی مضامین پر بھی کسی قدر انحصار کرنا پڑا جو اَب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

اکادمی کے بانی صدر جناب بخشی غلام محمد کی یاد میں یہ اشاعتِ خصوصی ترتیب دے کر ہم سُبکباری کے احساس سے سرشار ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہماری یہ کوشش قارئین کی پسندیدگی کا درجہ حاصل کرلے گی۔ ہمیں اس بارے میں ان کی آراء کا انتظار رہے گا۔

دریا و دَشت وکوہ کا حاصل نہ کر قبول
جو شے نہ ہو مذاق کے قابل نہ کر قبول
تو رہ نورِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

• — محمد اَشرف ٹاک

حافظ علی بہادر خان

بخشی غلام محمدؐ

چند جھلکیاں..........چند تاثرات

اِنگلستان کے مشہور زمانہ شاعر شیکسپیئر کی بہترین تعریف یہ کی گئی ہے کہ اس کی ذات ''وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت'' کی حامل تھی۔ He was one in many , many in one۔ بخشی صاحب میں بھی یہ کمال پایا کہ مجاہدوں میں مجاہد، مدّبروں میں مدّبر، مقرّروں میں مقرّر، دوستوں میں دوست، اَدیبوں میں نکتہ سنج، شاعروں میں سخن شناس اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اِنسانوں میں انسانیت کے علمبردار ہیں۔ اِن تمام خانوں میں اُن کی زندگی کے مظاہرے بنتے ہوئے ہونے کے باعث ایک مختصر مقالہ میں صرف چند جُھلکیاں یا چند تاثرات ہی پیش کیئے جاسکتے ہیں۔ اور قارئین سے یہ اپیل کی جاسکتی ہے کہ

تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

منصوبہ بندی کے دَور میں معذرت کے ساتھ بے ربط تجربات لکھتے ہوئے بڑے فخر کے ساتھ یہ دعویٰ بھی رکھتا ہوں کہ۔

من قاش فرود شے دل صد پارہ خویشم
لختے برد از دل گزرد ہر کہ زپیشم

عوام کے دِلوں پر قبضہ :۔

بخشی غلام محمد صاحب کی شخصیت کے ایک پہلو کا بار بار تجربہ ہوا ہے۔ لکھنؤ، ممبئی، دہلی، ناگپور، مراد آباد اور متعدد دیگر مقامات میں ان کے خصوصی استقبال میں شرکت کا موقع ملا تو مقامی جماعتی اختلافات کی وجہ سے میزبانوں میں ایک قسم کی گھبراہٹ پائی۔ ان کو یہ خطرہ پیدا ہوتا تھا کہ استقبال کے مظاہرہ میں کوئی برہمی نہ پیدا ہو جائے۔ چند مخالفانہ نعرے بھی بدمزگی کیلئے کافی ہوتے لیکن ہر جگہ یہی رُوح پرور تجربہ ہوا کہ مقامی اختلافات کے باوجود بخشی صاحب کے خیر مقدم میں کامل اِتحاد نظر آیا۔

بہت برس ہوئے لکھنؤ میں ایک زبردست مُسلم کانفرنس بخشی صاحب کی صدارت میں ہوئی تھی۔ میں ممبئی سے شرکت کیلئے لکھنؤ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک گروپ کو کانفرنس کے انعقاد سے نظریاتی اِختلاف ہے۔ اِس کا امکاں تھا کہ اختلافات کا بھاری یا ہلکا مظاہرہ کانفرنس میں ہو جائے لیکن بخشی صاحب کے ورود نے یہ جادو کیا کہ جب تک کانفرنس رہی سارے اختلافات مسرّت و خیر مقدم کے جوش میں غرق رہے۔

مُراد آباد میں تو ایک گروپ اس لئے خلاف تھا کہ اس کے نزدیک استقبال کے انتظامات کافی بہتر تھے اور ہر شہر کے لیڈروں میں ذاتی اختلافات کی بھی کافی شہرت تھی لیکن بخشی صاحب کے ریلوے پلیٹ فارم پر اُترتے ہی یہ معلوم ہوا کہ مراد آباد کی جنتا کا صرف ایک ہی نعرہ ہے 'بخشی غلام محمد زندہ باد'۔ بخشی صاحب ہر قسم کی بدنظمی کو سنبھالنے میں کمال رکھتے ہیں۔ اگر وہ دیکھتے ہیں کہ عوام کے بڑھتے ہوئے جوش کو قابو میں رکھنے کیلئے مقامی انتظامات کافی نہیں ہیں تو فوراً خود ساختہ منتظم بن کر یہ کمال دکھا دیتے ہیں۔ ناگپور کانگریس سیشن میں میں نے دیکھا کہ وسیع میدان کے ایک گوشہ میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کئی لاکھ کا اجتماع تھا۔ انسانوں کا

سمندر موجیں مار رہا تھا۔ اِنتظام کی قائم کردہ حدیں توڑ کر ہزاروں آدمیوں نے پلیٹ فارم کی طرف بڑھنا شروع کردیا۔ کتنے ہی آدمی دَب گئے اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ فوری تدارک نہ ہوا تو بڑی ٹریجڈی ہوجائیگی۔ کچھ عرصہ تک حشر برپا رہا اور لیڈروں کی اپیلیں بے کار ثابت ہوتی رہیں۔ آخر بخشی صاحب پلیٹ فارم سے کُودے اور موقع پر پہنچ کر اپنا کمال دکھانا شروع کردیا۔ یہ عمل برطانوی دَور میں جواہر لعل نہرو کیا کرتے تھے اور .... کبھی کبھی پرانا سبق دہرادیتے..... لیکن.... ..... بخشی صاحب ہی نے یہ رول اپنے ذمہ لے لیا..... کسی بھی عظیم قومی اجتماع میں نظم وترتیب پر آفت آئی اور بخشی صاحب پلیٹ فارم پر ہوئے تو وہ جلد ہی میدان جنگ کے گھمسان میں پہنچ جاتے ہیں اور مہابھارت کی گیر دار میں درانہ گھس کر تھوڑی ہی دیر میں اس طرح نظم قائم کردیتے ہیں کہ لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ دراصل یہ ثبوت ہے اس اَمر کا کہ بخشی صاحب کی محبت دلوں میں ہمہ گیر ہوگئی ہے اور دوسرے اِس اَمر کا ثبوت ہے کہ بخشی صاحب حقیقی معنوں میں عوامی لیڈر ہیں۔ صرف کشمیر کے نہیں بلکہ تمام ہندوستان کے۔

عوام سے تعلقات:۔

کافی عرصہ پہلے سرینگر میں ایک عظیم الشان قومی جشن ہوا تھا جس کی سرگرمیاں ایک ماہ سے زیادہ جاری رہی تھیں۔ مجھے اس وقت 'دورِ جدید' کا خاص نمبر شائع کرنا تھا لہٰذا کافی عرصہ سرینگر میں قیام کیا۔ اکثر بخشی صاحب کے ساتھ مختلف علاقوں میں سفر کرتا رہا۔ عجیب سماں دیکھا۔ دیہات وقریات میں جگہ جگہ لوگ موٹر روک لیتے تھے اور اپنی ضروریات پیش کردیتے تھے۔ اکثر درخواستوں پر بخشی صاحب فوراً فیصلے دے دیتے تھے۔ بعض ایسی درخواستیں رکھ لیتے تھے جن پر تحقیق

وغور کی ضرورت ہوتی تھی۔ چونکہ بخشی صاحب کے سفر میں یہ واقعات بالکل عام تھے اسلیئے وہ موٹر میں پیچھے کی نشست پر نہیں بیٹھ سکتے تھے بلکہ عموماً ڈرائیور کی برابر ہی بیٹھتے اور ان لوگوں کی درخواستوں پر اسطرح گفتگو اور فیصلہ کرتے کہ میں نے کبھی کسی گروپ کو غیر مطمئن نہیں پایا۔ ایک جگہ کسی دیہات مدرسہ کے لڑکوں نے موٹر کو روک لیا۔ شکایت یہ تھی کہ دُور سے تو جشن کیلیئے آئے مگر ان کو پروگرام میں نہیں شریک کیا گیا۔ حالانکہ اس وقت بخشی صاحب یورپ کے بعض خاص سیاحوں سے اہم ملاقات کیلیئے جا رہے تھے مگر موٹر سے اُتر کر لڑکوں کی بات سنی اور انہیں خوش کردیا۔ اُن کے واپس گھر جانے کیلیئے سواری کا بندوبست کردیا۔ لڑکے بخشی صاحب زندہ باد کے نعرے لگاتے چلے گئے۔

جب بخشی صاحب کی موٹر سرینگر کے حدود میں ہوتی تھی تو دکاندار دکانوں سے شہری کمروں سے اور آیندورند سڑکوں سے 'سلام علیکم' کی اِس طرح بوچھاڑ کرتے تھے گویا کہ وہ بخشی صاحب کو وزیرِاعظم سے زیادہ محبوب لیڈر یا رفیق کی حیثیت میں دیکھتے تھے۔ اُن کی کوٹھی کے سبزہ زار میں بھی عوام دُور دُور سے آکر اِکٹھے ہوا کرتے تھے اور اِس طرح اُپنے معاملات بے تکلفی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جیسے کہ وہ پُرانے رفیق دوست ہیں۔

میں ۱۹۲۰ء میں ناگپور کانگریس میں ڈیلی گیٹ تھا۔ اَب کافی برس سیاسی ہنگاموں میں گزر چکے تھے۔ ہندوستان کے اکثر نامی گرامی لیڈروں کے ساتھ زندگی کا کچھ حصہ بھی گزارنے کا موقع ملا لیکن یہ عجیب رنگ کسی کی زندگی میں نظر نہیں آیا۔ یہ بخشی صاحب کا مخصوص رنگ ہے اور واقعہ یہ ہے کہ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ
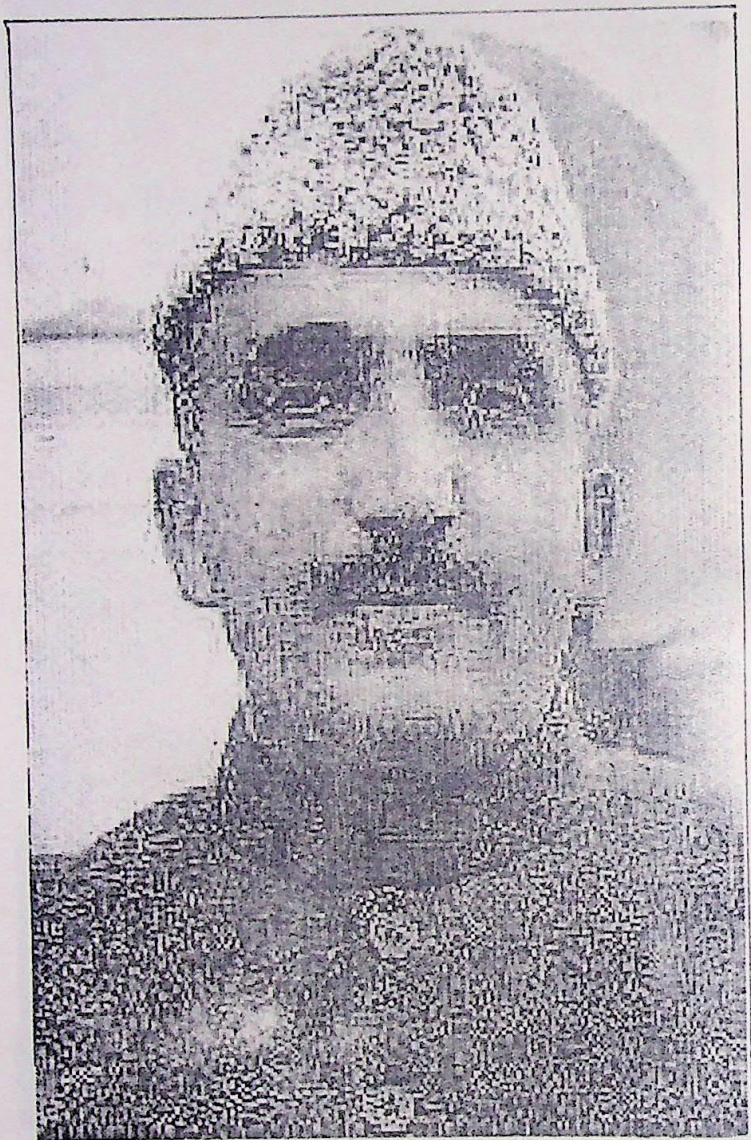
بخشی غلام محمد

بخشی غلام محمد
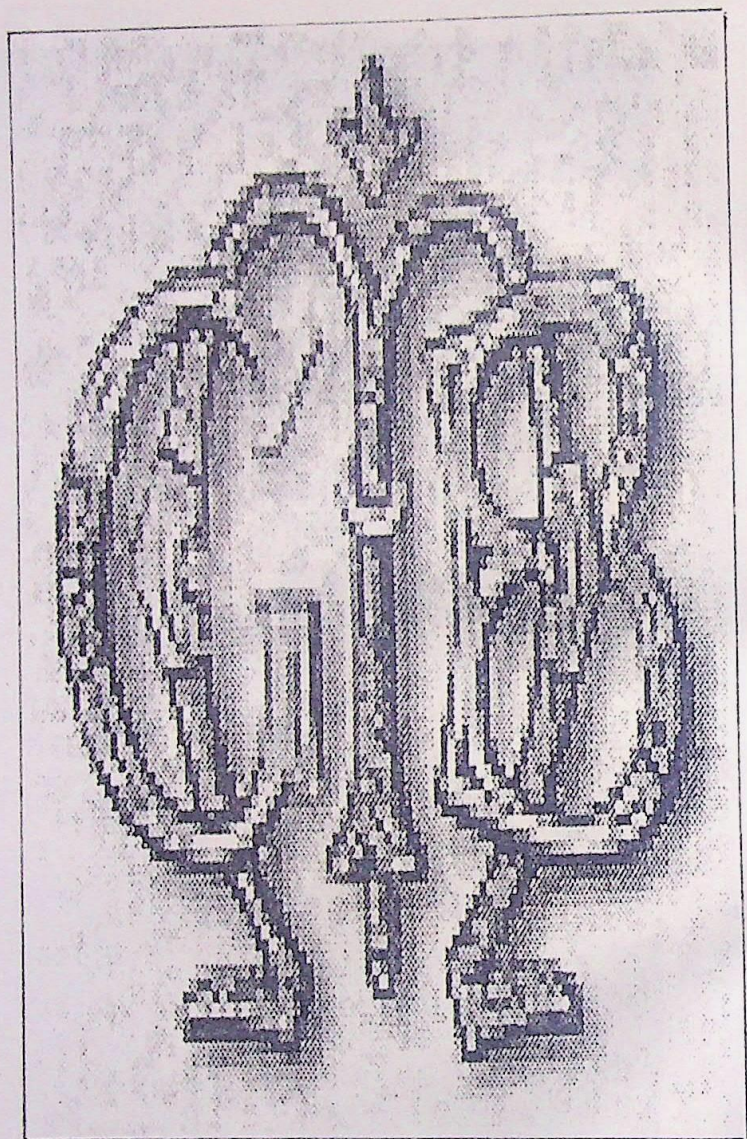
بخشی صاحب کی مُہر

بخشی غلام محمد - ڈاکٹر کرن سنگھ - غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ
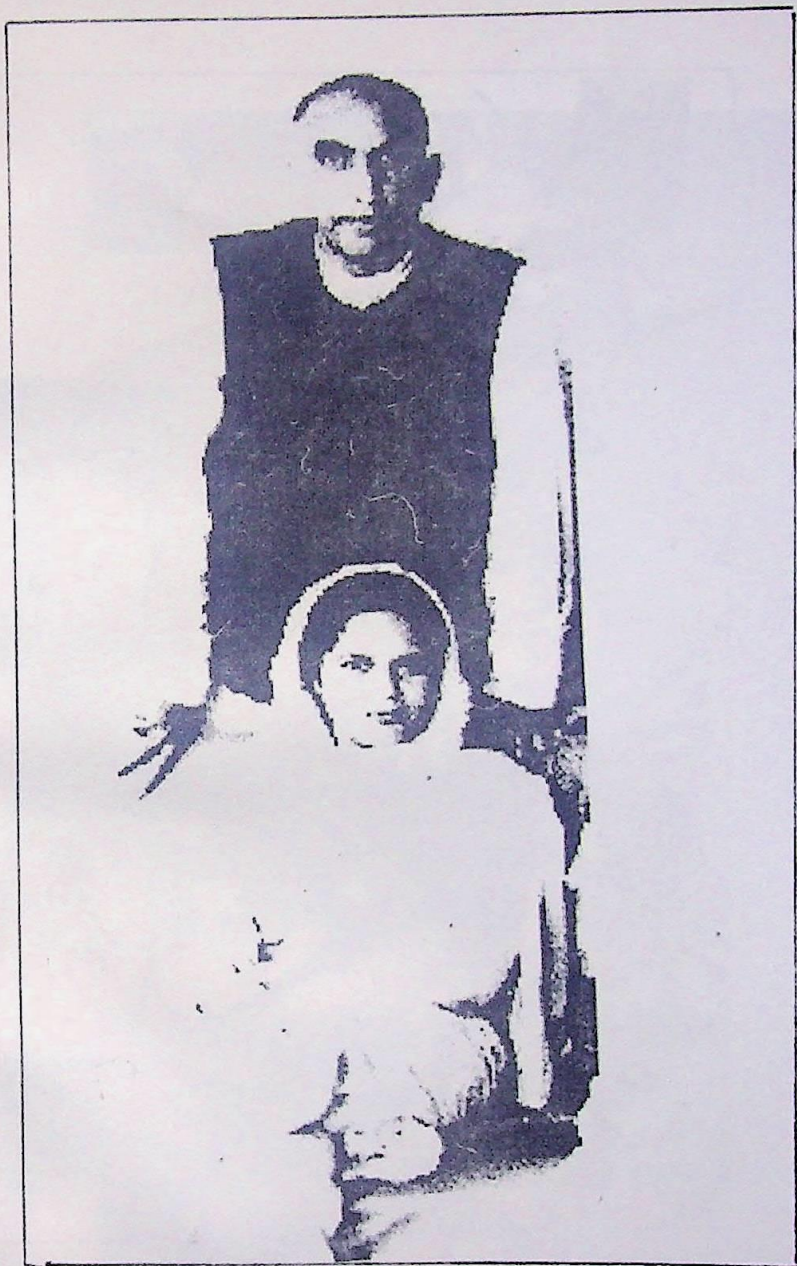
بخشی صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ

وزیراعظم بخشی غلام محمد اپنے دیگر رفقاء کے ہمراہ پانپور میں ویئیرنگ پلانٹ کا مشاہدہ کرتے ہوئے

عوامی شکایات کا ازالہ

کچھ عرصہ سے دہلی میں بخشی صاحب سے مل کر میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید ذمہ داریاں بڑھنے کی وجہ سے اب اُن کے کیریکٹر کا مذکورہ بالا رنگ تبدیل ہونے لگا ہے۔ لیکن مُراد آباد میں غلط فہمی دُور ہوگئی جبکہ وہاں کے اجتماعات میں بخشی صاحب کے اِسی کیریکٹر کی جھلکیاں نظر آئیں۔

اَدبی ذوق:۔

بخشی صاحب کی گرانبار ذمہ داریاں تھیں۔ ملاقات کرنے والوں کیلئے ان کی قیام گاہ ایک زیارت گاہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرصت بالکل مفقود ہے لیکن نہ معلوم اَپنی نیند قربان کر کے یا کسی سحر کارانہ طریقہ سے اَدبی ذوق پورا کرنے کیلئے وقت نِکال لیتے ہیں۔ ایک پریس کانفرنس میں بخشی صاحب نے نمائندگان اخبارات کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ غالباً مطلب یہ تھا کہ جو صاحب آجائیں گے ان کے قیام وغیرہ کا انتظام کر دیا جائیگا۔ اس پر ایک صحافی نے ہنس کر کہا کہ آپ نے جگرؔ مراد آبادی کو جو دعوت دی ہے تو اس پر کافی روپیہ بھی صرف کریں گے۔ بخشی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جگرؔ صاحب کی بات اور ہے۔ ان کو تو ہم کشمیر بھی بخش دیں اِس جملہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک بلند پایہ شاعر کیلئے بخشی صاحب کے کیا جذبات تھے۔ آپ انہیں کسی ایسی صحبت میں بِٹھا دیجئے جہاں اعلیٰ شعر پڑھے جارہے ہوں تو بخشی صاحب عدیم الفرصتی کی شکایت کبھی نہ کریں گے۔ واضح رہے کہ اَچھے شعروں کی شرط ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ شعر معیاری نہ ہوتو وہ گھبرا جاتے تھے۔ مشاعرہ کا بھی معیار گِر جاتا ہے تو وہ کسی حیلہ سے نکل جاتے تھے اور اگر معیار بلند رہے تو رات بھر جاگتے رہتے۔ سخن سنجی تو ان کا حصہ تھا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک کشمیری ہونے اور دہلی و لکھنو کی اَدبی صحبتوں سے محروم رہنے کے

باعث شعر واَدب سے ان کا تعلق صرف رسمی ہوگا۔ مجھے خود بھی ابتداء میں یہ ہی غلط فہمی تھی لیکن سرینگر کے قیام میں اس غلطی کی اصلاح ہوگئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں اُن کا ذوق اتنا بلند ہے کہ آج تک میں سوچا کرتا ہوں کہ بخشی صاحب میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہوئی۔ مکرّر لکھتا ہوں کہ وہ معمولی سخن سنج نہیں بلکہ شعرو اَدب کے ہر پہلو کو بدرجۂ اتم سمجھتے ہیں اور ان کی داد بہت ہی قابلِ قدر ہوتی ہے۔ غیر معیاری شعر پر داد دینے میں نے انکو کبھی نہیں دیکھا۔

ہاں ایک بات اور، وہ یہ کہ جس طرح شعر واَدب کی صحبت سے انہیں گہری دلچسپی تھی اِسی طرح مجلس سماع سے بھی خاص مناسبت تھی۔ اہلِ کشمیر کی زندگی میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے اور بخشی صاحب اِس بارے میں کشمیریوں کی پُوری پُوری نمائندگی کرتے تھے۔ بغیر کسی خاص مجبوری کے وہ محفلِ سماع سے نہیں اٹھتے۔

ایک اُلجھن:

میری زندگی کا اکثر حصہ مسلمانوں میں کام کرتے گزرا۔ آزادی سے قبل جہادِ وطن کی تبلیغ تھی اور آزادی کے بعد جو خاص مسائل مسلمانانِ ہند کے متعلق پیدا ہوگئے ان کے حل میں اپنی حقیر استطاعت کے مطابق مصروف رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دَورے کرنے کا بھی موقع ملا۔ اُپنے تجربات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر بخشی غلام محمد صاحب مسلمانانِ ہند کی قیادت کی ذمہ داریاں سنبھال لیتے تو شاید یہ مسائل حل ہوجاتے ورنہ اندیشہ تھا کہ فرقہ پرستی کا عفریت اپنے چنگل ہر چہار طرف دراز کر کے ملک وملت کو بڑی ٹریجڈی سے دوچار کردے گا۔ کئی بار میں نے بخشی صاحب کو ترغیب دی کہ وہ سارے ہندوستان کے مسلم مسئلہ کیلئے بھی وقت نکالیں۔ اس میں شک نہیں کہ

انہوں نے ہمیشہ مسلمان ہند کی مشکلات میں مدد کی مگر میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ مسئلہ کشمیر کی اُلجھن مجبور کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کے عام مسائل میں صرف ایک حد تک ہی عملی دلچسپی لیں۔ کشمیر کی ذِمہ داریاں اتنی گرانبار اور اتنی نازک ہیں کہ ان کی خاطر وہ آگے قدم نہیں بڑھاتے ورنہ اس وقت وہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے محبوب ترین رہنما تھے اور انڈین یونین کی حکومت میں بے پناہ اَثر رکھتے تھے۔ لہٰذا جہاں اور لیڈر ناکام رہتے ہیں وہاں وہ کامیاب ہو سکتے تھے۔

بخشی صاحب کی زندگی کی یہ چند جھلکیاں ہیں جو سادہ الفاظ میں پیش کر دی گئی ہیں۔ اگر یہ یقین ہوتا کہ 'شیرازہ' کے اس نمبر میں مزید گنجائش نکل سکتی ہے تو اور کتنے ہی مشاہدات ہیں جو اِشاعت کے مستحق ہیں اور جن میں قوم کیلئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ بخشی صاحب کی زندگی کا لب لباب یہ ہے

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فضا ابن فیضی
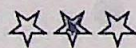
غزالِ کشمیر

(خالدِ کشمیر کی سالگرہ پر)[1]

بنامِ لالۂ و گل حُسنِ زندگی کیلئے
بڑے شگفتہ و رنگیں پیام لے کے اُٹھا

ہزاروں صبح کے جلوے سموئے آنکھوں میں
جبینِ شوق پہ ماہِ تمام لے کے اُٹھا

نفس نفس پہ لُٹاتا ہوا متاعِ سکوں
قدم قدم پہ حیات دوام لے کے اُٹھا

تو اپنے تشنہ لبوں کی فسردہ محفل میں
مئے حیات سے لبریز جام لے کے اٹھا

بہشت آب و کشت و سبزہ زار میں تو
نسیم کا نفس خوش خرام لے کے اُٹھا

اسیر ہونے کو بے تاب ہیں تمام آہو
یہ کون عنبریں زلفوں کے دام لے کے اُٹھا

یہ کون مست چناروں کے نرم سایے میں
جو صبح سے بھی حسیں ہے وہ شام لے کے اُٹھا

●

غزالِ وادیٔ کشمیر! شوق میں تیرے
مرا کھلا ہوا آغوش بن گیا ہے ختن

نظر میں پھول کھلے، ذہن میں کلی چٹکی
ترا نفس ہے بہاروں کا عنبریں دامن

وہ بزمِ شعر وہ تقریبِ جشنِ گل[1] وہ سماں
ہے تیرے لطف سے گلگوں قبائے شعر سخن

وہ خلد شوق شبِ شالیمار کے جلوے
وہ رقصِ روح وہ رقصِ نظر وہ رقصِ بدن

---

[1] جشنِ کشمیر

کھلے کھلے سے گریباں وہ حسن و مستی کے
وہ موج رنگ میں بھیگے ہوئے سے پیراہن

بہ این نشاطِ طبیعت بھی تیرے سینے میں
سنی گئی ہے دلِ کائنات کی دھڑکن

وہ کسمسا اٹھی کشمیر کی جواں تہذیب
تیرے سبو کی مئے تند ہے خُمار شکن

•

اَداشناس جنوں سے مرے کوئی پوچھے
تری نگاہِ طرب کا فسونِ دل داری

بھرا بھرا وہ جہلم کا نیلمیں سینہ
وہ زر نگار شکاروں کی نرم رفتاری

کہیں سفیدوں کے جھرمٹ کہیں گلابوں کے
سرینگر ہے کہ شہرِ طلسم گل کاری

گلاب و عطر کی ان خواب وش فضاؤں میں
تری نوا نے جلائے چراغ بیداری

ترے فروغ تدبّر سے صبح بن کے رہی
وہ رات جو ترے دیدہ وروں پہ تھی بھاری

جو بَرف زاروں کے سینے میں آج روشن ہے
نہ بجھ سکے گی وہ ذوق عمل کی چنگاری

محمدؐ عربی کے غلامِ با اقبال
نئی اَدا سے ذرا ڈال طرحِ خودداری

•

محیطِ قلب و نظر تھی جو تیرگی اس کو
ترے شعور نے ظرفِ سحر میں ڈھال لیا

جہاں سے ایک قدم بھی گزرنا مشکل تھا
وہاں بھی تو نے نیا راستہ نکال لیا

جو کھائی رُزم گہہ زندگی میں چوٹ کہیں
تو زخم دل پہ تبسم کا پردہ ڈال لیا

تھا جس کے بخت میں جامِ جہاں نما ہونا
ترے جنوں نے وہی ساغرِ سفال لیا

پڑی تھی تجھ پہ یہ کس پیر میکدہ کی نظر
کہ تو نے گرنے سے پہلے ہمیں سنبھال لیا

کچھ اور بڑھ گیا گلمرگ و پہلگام کا حُسن
جو تو نے ہاتھ میں آئینہ جمال لیا

ہے ذرّہ ذرّہ گزر گاہِ آفتاب ترا
کہاں سے تو نے مرا شعلۂ خیال لیا

•

یہ زندگی کی اُمنگیں یہ حریت کی ترنگ
ترا شعور سیاست بڑا حسیں نکلا

ترا پیام ہے چہرہ کشائے حُسنِ عمل
ترا پیام بہت عہد آفریں نکلا

عجیب شے ہے ترا غمزہ مسیحائی
کہ زہر دولت تریاق کا امیں نکلا

دیا ہے جس نے ترے پائے شوق کو بوسہ
وہ خار پھول سے بھی بڑھ کے نازنیں نکلا

فروغ نورِ سحر منہ چھپائے پھرتا ہے
تری شبوں کا اندھیرا بھی مہ جبیں نکلا

تجھے جُنوں نے یہ کن راستوں پر ڈال دیا
کہ آج تک نہ خم زلفِ عنبریں نکلا

نشاط باغ سے آئی وہ پھر ہوائے جنوں
کچھ اور حوصلۂ جیب و آستیں نکلا

●

وہ تیری طبع زمانہ شناس کی تیزی
کہ شاخِ گل کو بھی تلوار کرلیا تو نے

بُلا کے گو کہ نشیب و فراز تھے لیکن
رہِ حیات کو ہموار کرلیا تو نے

فروغِ راحت کونین بن کے جیتے ہیں
وہ حادثات جنہیں پیار کرلیا تو نے

ثبات وعزم کی اِس نکہت پریدہ کو
نفس میں اپنے گرفتار کرلیا تو نے

ترے اُفق پہ ہے کس آفتاب کا سایہ
کہ اور صبح کو گلنار کرلیا تو نے

چمن میں چھیڑ کے خاتوں حبہ کے نغمے
سکوتِ گل کو غزل بار کرلیا تو نے

نوائے بربطِ مہجور و نغمۂ آزاد
ہر ایک ساز کو بیدار کرلیا تو نے

●

یہ مجھ سے پوچھ تری سحر پاش نظروں نے
جگا دیا ہے ہر اِک دل میں جادوئے کشمیر

جواں ہے تیری محبت سے چہرۂ لداخ
ترے خلوص سے ہے گرم پہلوئے کشمیر

یہ آبشار کا سیماب، برف کی چاندی
یہ کون لے کے چلا پھر مجھے سوئے کشمیر

یہ رام بن، یہ جلوہ خانہ حسن فطرت کا
یہ بانہال یہ محراب ابروئے کشمیر

وہ ابرِ میکدۂ عیش باغ سے اٹھا بکھر گئے مرے شانوں پہ گیسوئے کشمیر
ہوا ہے تیرے تصوّر میں بارہا محسوس مرے گلے میں حمائل ہیں بازوئے کشمیر
یہ چاندنی یہ شگوفے یہ موجِ نکہت و رنگ خود اپنے دام میں ہے آج آہوئے کشمیر

خدا کرے نہ کبھی یہ بہار کمھلائے
یہ جشنِ زہرہ و ناہید تجھ کو راس آئے

●

نغمۂ نو

سلام مچھلی شہری

صبح کچھ اور ہے، اِس خُلد کی ہے رات کچھ اور
ساز کچھ اور ہیں اِس بزم کے نغمات کچھ اور
دورِ دلکش کے تو پہلے بھی تھے کچھ دعویٰ اور
خالدِ وادیٔ کشمیر کی ہے بات کچھ اور

نریش کمار شادؔ

ہفت رنگ

(خالدِ کشمیر بخشی غلام محمد کی نذر)

روشنی کے ضمیر زندہ باد ——— صبحِ نَو کے سفیر زندہ باد
تو رُخِ کاشمیر کی ضو ہے ——— خالدِ کشمیر زندہ باد

کیف پَرور ہے وادیٔ کشمیر ——— حسُن کا گھر ہے وادیِ کشمیر
جس میں خوشبو ترے شعور کی ہے ——— وہ گُلِ تر ہے وادیِ کشمیر

تو نے بدلی عوام کی تقدیر ——— اَے خُوشا تیرا جذبۂ تعمیر
ذرّے ذرّے سے آ رہی ہے صدا ——— آفرین بر تُو خالدِ کشمیر

اَپنے اخلاصِ بے پناہ کا رنگ ——— ہر کسی کی نظر میں بھرتا ہو
حکمراں ہے وہی جو تیری طرح ——— حکمرانی دِلوں پہ کرتا ہو

کیوں نہ ہو دَرد مند دل تیرا ——— تیرے سینے میں ہے عوام کا دل
تجھ سے وابستہ شوکتِ کشمیر ——— تجھ[1] سے تاباں جبینِ مستقبل

تو حقیقت میں خالدِ کشمیر ——— ایک شمشیر بھی ہے ساز بھی ہے
فطرتاً سرفروش ہے لیکن ——— طبعاً اک اَدب نواز بھی ہے

ہوں دُعا گو بقولِ غالبؔ میں ——— اے نئے کاشمیر کے معمار
تو سلامت رہے ہزار برس ——— ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۱۔ یہ مصرع حضرت جوش ملیح آبادی کا ہے (شاد)
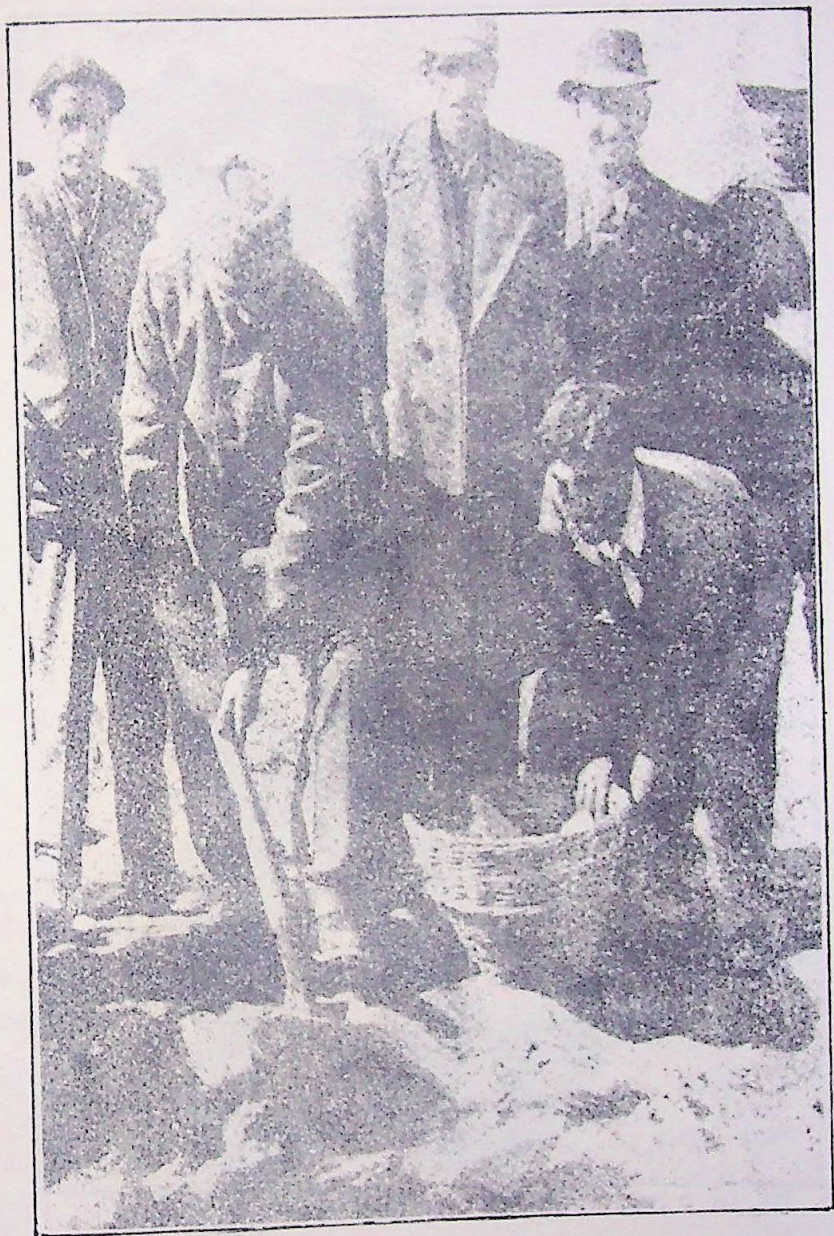
بخشی صاحب — بہترین ساتھی — اچھا مددگار

بخشی صاحب...... کشمیری پیالے سے چائے نوشی کا بے ساختہ انداز

ڈور دراز علاقوں کا دورہ

محمد یوسف ٹینگ

بڑے بخشی صاحب[۱]........

یادِ یارِ مہرباں آید ہمی!

۹؍اگست ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کو گرفتار کر کے اُودھم پور کے تارا نِواس میں بند کر دیا گیا۔ شام کو بخشی غلام محمد نے نئے وزیر اعظم کی حیثیت سے ریڈیو پر 'قوم کے نام پیغام' سنایا۔ میں نے اُپنے قصبے شوپیان میں ایک کمیونٹی سینٹر پر یہ تقریر سنی۔ بخشی جیسی آواز سے اگر خوف نہیں تو بھی کشمکش اور گُریز کا احساس صاف ہوتا تھا۔ انہوں نے تقریر میں اَپنے محسن اور لیڈر کا نام ایک بار بھی نہیں لیا۔ صرف یہ کہا کہ جن ساتھیوں کے کاندھا سے کاندھا مِلا کر ہم نے آزادی کی جنگ لڑی، آج اُن کے ساتھ جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ اُپنی تقریر میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ اِس بڑے واقعے کی کیف وکم کا فیصلہ آنے والا وقت (یعنی تاریخ) کرے گا۔

پھر میں نے ۲۵؍فروری ۱۹۷۵ء کو شیخ محمد عبداللہ کی وہ تقریر بھی ریڈیو سے ہی سُنی جب وہ بائیس برس کے بعد وزارت اعلیٰ کی کُرسی پر لوٹ آئے اور اُنہوں نے بھی شام کو پیغام نشر کیا۔ انہوں نے بھی ۹؍اگست ۵۳ء کا ذکر کرتے ہوئے بخشی

۱۔ بخشی غلام محمد کے زمانہ اقتدار میں اور بخشی صاحبان کے ناموں کا ڈنکہ بھی بجتا تھا۔ اِسی لئے خود اِنہیں بڑے بخشی صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

صاحب کا نام نہیں لیا جو تین سال پہلے رحلت کر گئے تھے۔ انہوں نے کہا "۱۹۵۳ء کے معاملے کو میں تواریخ کے سُپرد کرتا ہوں۔ وہی اِس پر اپنا فیصلہ صادر کرے گی"۔ (یہ جملے تقریروں کی چھپی ہوئی نقول سے نہیں لئے گئے ہیں بلکہ حافظے سے اُتارے گئے ہیں اور اِن میں الفاظ کی نشست و برخاست میں تفاوت ہو سکتی ہے)

بہر حال آج جب بیسویں صدی کے کشمیر کے یہ دُو بہت بڑے کردار اپنے مولیٰ کی درگاہ میں ہیں، مجھے اپنا یہ عندیہ بیان کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ میری حقیر رائے میں ۱۹۵۳ء کے واقعات کے بارے میں تاریخ نے بخشی صاحب کے نہیں بلکہ شیخ صاحب کے حق میں فیصلہ صادر کیا ہے۔ ۹/اگست ۵۳ء کو جو کچھ ہوا، جموں و کشمیر کے گزشتہ سولہ سترہ سال کے سرو ناش کے پیچھے انہی کی گڑگڑاہٹ موجود ہے۔ لیکن اِتنا کہنے کے بعد میں مرحوم شیخ صاحب سے اپنی اُس گفتگو کو بیان کرنے کو ضروری سمجھتا ہوں۔ جب اُنہوں نے ایک دِن اپنی پچھلی زندگی کے حالات پر ایک واپسی نظر ڈالتے ہوئے بڑی صدق دلی سے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ اگر ۱۹۵۳ء میں بخشی وفا کرتا اور ہمارا ساتھ دیتا تو میں دِلی دربار کو ناکوں چنے چبواتا (ان کا کہا ہوا اصل کشمیری فقرہ یہ ہے،...... بہ دِمہ ہا دِلہ والین میٔز نوٗن)۔

شیخ صاحب کے اِس دعوے کے سچ یا جھوٹ ہونے کا فیصلہ کبھی نہیں ہو سکے گا کیونکہ یہ ایک فرضی صورت حال یا خوش اندیشی کی پیداوار ہے۔ لیکن اِس سے اتنا معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ رقابت اور دُشمنی کی آخری حدیں چھُونے کے باوجود شیخ صاحب کی اپنے ایک وقت کے رضا کار، پھر نائب اور آخر کو حریف کے بارے میں کیا رائے تھی اور وہ انکی صلاحیتوں اور حکمت عملی کے کس قدر مُعترف تھے۔ شیخ صاحب نے انہیں مرزا محمد افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق، مولانا مسعودی اور دوسرے اعلیٰ پایہ

کے ہم سفروں پر فوقیت دی تھی اور انہیں اپنا نائبِ وزیراعظم بنایا۔ جب کہ بخشی صاحب کی رسمی تعلیم بس یوں ہی تھی اور جیل جانے وغیرہ کا ریکارڈ بھی بس تھوڑا بہت۔ ظاہر ہے کہ شیخ صاحب ان کی غیر متزلزل وفاداری کے علاوہ اُن کی اِنتظامی قابلیت اور گوناگوں خوبیوں پر بھی فریفتہ تھے۔ شیخ صاحب نے بخشی صاحب کی علیحدگی پر اُن کو موردِ الزام ضرور ٹھہرایا لیکن وہ 'آتشِ چنار' میں ان کے دور میں ہونے والے اچھے کارناموں کی جی کھول کر تعریف کرتے ہیں اور ان کے کام کو سراہتے ہیں۔

بخشی غلام محمد سے سیاسی اِختلاف کرنا آسان ہے۔ ایسا پہلے بھی کیا گیا ہے اور آئندہ بھی کیا جاتا رہے گا۔ لیکن جن لوگوں کو ان سے ملنے جلنے اور اُن کے دَور میں گزر بسر کرنے کا موقعہ ملا ہے، وہ اُن کی انتہائی غیر معمولی شخصیت کو بُھلا نہیں پائیں گے۔ اور یہ بھی کہیں گے کہ ایسی خوبیوں والا آدمی انہوں نے اپنی زندگی میں پھر نہیں دیکھا۔

بخشی صاحب میں ایک بہت بڑا گُن اُن کا غیر معمولی اور بے پناہ حافظہ تھا۔ وہ پُختہ عمر پا کر گزر گئے۔ لیکن آخر تک اُن کی یادداشت کا چراغ ٹمٹماتا نظر نہیں آیا۔ وہ ہزاروں کے جلسے میں کسی چہرے کو پہچان کر اُس کے باپ بلکہ گھرانے کی ساری تفصیلات اِس طرح بیان کر لیتے تھے جیسے وہ اُن کے اپنے کنبے کا کوئی فرد ہو۔ حالانکہ اصل میں اُس کو انہوں نے برسوں پہلے دیکھا ہوتا تھا۔ مجھے اِس سلسلے میں اپنی ذات سے وابستہ ایک حیرت انگیز واقعہ یاد آتا ہے۔ یہ ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے۔ میری صحت اُن دنوں بہت خراب ہوگئی تھی۔ بلیک موشن کے بعد یرقان اور میرے چہرے پر کالے دھبے (کشمیری میں برزِنی) پڑ گئے تھے۔ مجھے کشمیر کے ڈاکٹروں نے دِلی جا کر چیک اَپ کرانے کا مشورہ دیا تھا کہ اُن دِنوں یہاں انکی صورت بہت فرسودہ تھی۔ شوپیان کے ایک باذوق میوہ بیوپاری مرحوم عبدالقادر دیوان میرے

دوست تھے۔ وہ سردیوں میں میوہ بیچنے اور کشمیر کے ظالم جاڑے سے بچ نکلنے کیلئے دِلی جاتے تھے۔ انہوں نے مجھے ساتھ لے لیا۔ دِلی میں بتایا گیا کہ سب سے اچھا چیک اپ امریکن اسپتال (یہ آل انڈیا انسٹی چیوٹ آف میڈیکل سائنسز کا مقامی نام تھا۔ یہ تازہ بنا تھا اور امریکی ڈیزائن پر)۔ لیکن وہاں تک رسائی نہیں تھی۔ بخشی غلام محمد اُن دنوں اِقتدار سے الگ تھے۔ لیکن ممبر پارلیمنٹ کی حیثیت سے وہاں کیننگ لین کے پاس ایک مکان میں فروکش۔ مگر اِختیار وغیرہ میں دِلی والوں نے انہیں حاشیے پر الگ تھلگ کر دیا تھا۔ ایک دن ہم نے ٹھان لی کہ بخشی صاحب کے پاس جائیں گے۔ ایک تو سلام دُعا رہے گی اور اگر قسمت اچھی رہی تو وہ شاید ہمارے آڑے آئیں۔ میں بخشی صاحب سے خُوب واقف تھا کہ اُنہوں نے ہی ۱۹۵۶ء میں مجھے محکمہ اطلاعات میں اور پھر ۱۹۶۲ء میں اکادمی میں ملازمت دی تھی۔ دیوان کے خانوادے کے ساتھ بھی اُن کی علیک سلیک رہی تھی لیکن خود عبدالقادر صاحب ان سے ملنے کی کوئی یادداشت نہیں رکھتے تھے۔ ہم بخشی صاحب کے یہاں پہنچے۔ ہمیں باہر لان میں بٹھایا گیا اور پھر جب بخشی صاحب نکلے تو انہوں نے اپنی عادت کے مطابق ہماری خوب پذیرائی کی۔ انہوں نے چائے منگوائی اور ہمارے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ میں نے ان کو مہربان دیکھا تو اپنی مشکل بیان کردی۔ انہوں نے میرے چہرے پر ٹکٹکی لگا کر دیکھا اور کہا 'ارے اوشوپیان کے قندی کلچے، تم نے اپنی یہ صورت کیا بنا رکھی ہے۔ تمہارا غم نہیں مگر میرا دوست عبدالرزاق کیا کرے گا'، (وہ میرے والد مرحوم عبدالرزاق ٹینگ کو ۱۹۳۵ء سے جانتے تھے اور لاہور میں جب میرے والد میوے کی تجارت کے سلسلے میں مقیم تھے تو بخشی صاحب ان کے مہمان بنے تھے)۔ انہوں نے مجھے دو

دن کے بعد صبح آٹھ بجے آنے کو کہا اور بتایا کہ انسٹی چیوٹ کے ڈاکٹر صبح سویرے ہی ملتے ہیں بعد میں نہیں۔ چائے آئی اور ہم نے پی لی۔ لیکن اِس دَوران مجھے یہ عجیب سا لگا کہ وہ بار بار دیوان صاحب کی طرف نظریں اُٹھاتے اور پھر ہٹاتے۔ پھر ان کو دیکھنے لگتے اور پھر نظریں مجھ پر مرکوز کرتے۔ جب چائے ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے کہا کہ ''ذرا میرے ساتھ چلو''۔ ہم اُٹھ کے تھوڑی دُور چلے اور میں نے دل میں سوچا کہ یہ شاید میری بیماری کے متعلق کوئی سوال پوچھیں گے لیکن جو کچھ انہوں نے مجھ سے پوچھا، اس پر میں دَنگ رہ گیا۔ کہنے لگے کیا یہ دیوانوں کا لڑکا ہے؟ میں نے حیرانی میں جواب دیا ہاں۔ بخشی صاحب نے میری بات سُنی تو جیسے ان کی باچھیں کھِل گئیں اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیوان صاحب کے پاس پہنچے۔ تمہارے بڑے بھائی کیسے ہیں؟ دیوان صاحب بھی دیکھتے رہ گئے۔ بخشی صاحب نے خود کہا کہ بہت پہلے میں شوپیان ٹاک صاحبان کی شادی پر گیا تھا۔ ٹاک صاحبان ایک وقت شوپیان کے رئیسانِ اَوّل تھے۔ شوپیان میں اَب بھی ان کی وسیع وعریض حویلی شانِ رفتہ کی گواہی دے رہی ہے اور ستّر اسّی سال کے بعد بھی شوپیان کا سب سے بڑا اور اُونچا مکان ہے۔ بخشی صاحب کہتے رہے، ''وہاں غلام محمد دیوان (غلام قادر کے بڑے بھائی، جن کے انتقال پر بیس سال سے زیادہ گُزر چکے تھے) اور اُسکی انگلی پکڑے ہوئے ایک بچہ...... یہی غلام قادر۔ مجھے اس کے چہرے پر چیچک کے نشان اَب تک یاد ہیں''۔ خود دیوان صاحب کو اس واقعے کی کوئی یادداشت نہیں تھی کہ وہ اس وقت بچپن کی عمر میں رہے ہوں گے۔ بہر حال بخشی صاحب دیوان سے کچھ عرصہ تک باتیں کرتے رہے اور پھر اسے کہا کہ پرسوں تم یوسف کو ساتھ لے کر آنا۔ ٹھیک آٹھ بجے...... ہم کوٹھی سے نکلے تو سراپا استعجاب تھے۔ یہ انسانی

حافظہ کا ایسا کرشمہ تھا جس کا سامنا کرنے کے بعد عش عش کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا اور اس پر طرّہ بخشی صاحب کی خندہ پیشانی اور حُسن سلوک۔

ہم مقرّرہ دن پہنچے تو بخشی صاحب فوراً برآمد ہوئے۔ باقاعدہ پوشاک اور چُست و دُرست...... انسٹی چیوٹ میں اُن کے نام کی دُھوم تھی۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اُن دنوں انسٹی چیوٹ کے سب سے مشہور ڈاکٹر رائے کے پاس پہنچ گئے۔ (افسوس آج مجھے ڈاکٹر صاحب کا پورا نام یاد نہیں ہے)۔ ڈاکٹر رائے نے بخشی صاحب کی بڑی تعظیم کی۔ معلوم ہوا کہ وہ اُن کے دِل کے بھی معالج ہیں۔ بہر حال انہوں نے میرا تفصیلی ملاحظہ کیا اور چند ٹیسٹ کرنے کیلئے چٹھیاں تحریر کیں۔ میرے ٹیسٹ کا سلسلہ دَراز ہوتا گیا اور دیوان صاحب تھک گئے۔ انہیں سبزی منڈی سے میرے ساتھ چلنا پڑتا تھا۔ بہر حال ایک دن مجھے ڈاکٹروں نے ایک خاصے کڑے ٹیسٹ کیلئے تیار ہو کر آنے کیلئے...... فاقہ کر کے اور کسی کو سہارا دینے کیلئے ساتھ لے کر...... میں واپسی پر بخشی صاحب کی کوٹھی سے ہوتا ہوا گیا کہ اُنہوں نے کہا تھا دوسرے تیسرے روز مجھے خبر سناتے رہنا۔ خوش قسمتی سے وہ تشریف رکھتے تھے۔ میں نے اپنا ماجرا سُنایا اور آنے والے مُشکل مرحلے کا بھی۔ کہا ہاں ہاں۔ تمہارے جگر، معدے اور دِل میں مشینیں ڈالی جائیں گی۔ مشکل ہے مگر 'دَے کرِ سہلے' (خدا آسان کردے گا)۔ مگر میں کل خود تمہارے ساتھ چلوں گا۔ پورے آٹھ بجے آنا۔ میں اِس مہربانی کے آگے دَبا جا رہا تھا۔ لیکن بخشی صاحب اندر چلے گئے۔ اُن کے قیلولہ کا وقت ہو گیا تھا۔ میں ڈیرے پر آیا۔ اور صبح ڈاکٹروں کا کہا پورا کرتے ہوئے بخشی صاحب کے یہاں پہنچ گیا۔ بخشی صاحب نے اپنی گاڑی نکلوائی۔ مجھے بیٹھنے کو کہا اور ہم انسٹی چیوٹ پہنچ گئے۔ واقعی بہت تکلیف دہ عمل سے

گزرنا پڑا۔ لیکن بخشی صاحب میرے سَر پر ہاتھ رکھتے رہے۔ کبھی میرا کُرتہ اُوپر نیچے کرتے رہے اور جب کبھی میں درد کے مارے کراہنے لگتا تو میری ڈھارس بندھاتے رہے۔ ''ھیا۔ شُر چھکھا...... صبر صبر ژہ گژھک نو ونوٹ ہیو (صبر کرو۔ تم تو بالکل صحت مند ہو جاؤ گے)۔ اِتنے میں ایک مشین پر بیٹھتے ہوئے مُتعلقہ ماہر نے دُودھ کا ایک گلاس پینے کی تاکید کہ اِس کے بعد ہی میرے نظامِ ہاضمہ کی اصل صورت سامنے آئیگی۔ ماہر موصوف اُپنے کام میں لگا رہا۔ بخشی صاحب نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی مگر وہ کسی کو دُودھ کا گلاس لانے کی فرائش نہ کر سکے اور پھر انہیں دینے کی عادت تھی، مانگنے کی نہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے مجُھ سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرنا۔ میں ہکّا بکّا وہاں کھڑا تھا۔ ماہر موصوف دوسروں کے ٹیسٹ کرنے میں مصروف تھے۔ ایک بار میرے پاس آیا اور پوچھا 'Did You Take Milk' میں نے نرمی سے اِنکار کیا تو وہ پھر اُپنے کام میں گمُ ہو گیا۔ اِتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ بخشی صاحب کچھ کچھ ہانپتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں دُودھ سے بھرا شیشے کا گلاس تھا۔ ہم شاید نویں دَسویں منزل میں تھے۔ وہ لفٹ سے اُتر کر بازار گئے تھے۔ وہاں دُودھ کے ساتھ اِسکا گلاس بھی خرید لائے تھے اور پھر لفٹ سے ہی اُوپر چڑھ آئے تھے۔ انہوں نے ماہرِ موصوف کی توجہ دلائی۔ جس نے مجھے مشین کے سامنے کر کے گھونٹ گھونٹ پینے کو کہا۔ بہر حال ٹیسٹ ختم۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ بخشی صاحب نے کہا کہ چلو آج میرے ساتھ ہی لنچ کھالینا۔ میں اپنے احساسات کا کیسے بیان کروں کہ ایسے موقعوں پر الفاظ کے پَر جلتے ہیں اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ مولانا رومی کا یہ شعر برجستہ نوکِ قلم پر آ گیا ہے۔

من گنگ خواب دیدم و عالم تمام کر

من عاجزم زِ گفتن و عالم شنیدنش

(مجھ گونگے نے ایک خواب دیکھا۔ لیکن دُنیا تو بھری ہے۔ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں تو دنیا سُننے سے بے بہرہ)۔

مجھے یاد ہے کہ بخشی صاحب کی گاڑی ۵۔ پرتھوی راج روڈ میں کشمیر ہاؤس کے سامنے سے گزری۔ بخشی صاحب مجھ سے مُخاطب ہوئے، ''جب شیخ صاحب وزیراعظم کی حیثیت سے یہاں آتے تھے تو پوری دِلی ہِل جاتی تھی۔ میری وزارت کے دَوران بھی جب میں یہاں آتا تو بھی نصف دِلی تو ہِل ہی جاتی تھی۔ مگر اَب سناٹا ہوگیا ہے''۔ ہم کوٹھی پہنچے تو بخشی صاحب تازہ ہونے کیلئے اندر گئے لیکن مجھے سخت لہجے میں کہا ''اتھی تھے بہہ زِ......ینہٖ دُگ تھاوک''۔ (وہیں جمے رہنا۔ کہیں سَر پر پاؤں رکھ کر نہ بھاگنا)۔ کچھ دیر بعد ہم ڈنر ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ باتوں باتوں میں شیخ صاحب کا ذکر آگیا۔ جو اُن دنوں کوٹلہ لین میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ بخشی صاحب نے اَب اُن سے پھر راہ بنالی تھی۔ بلکہ مُسکراہٹوں اور ہلکی پھلکی باتوں کی نوبت آگئی تھی۔ بخشی صاحب جیسے جادُوگر کیلئے کیا مشکل تھا۔ بخشی صاحب چہکتے ہوئے بولے ''میں نے کل شیخ صاحب کو ہرن کا شکار بھیجا تھا۔ کسی دوست نے راجستھان سے لایا تھا۔ پورا ہِرن۔ البتہ اسکی ایک ران ذائقہ چکھنے کیلئے رکھ لی تھی۔ میرا خیال تھا شیخ صاحب کیلئے کافی کچھ رکھا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ پھر شیخ صاحب موصوف نے کیا کہا''

میں نے جواب دیا ''جناب مجھے کیا معلوم''

کہا کہ شیخ صاحب نے شکار کو گاڑی سے اُتار کر اندر رکھوادیا۔ مگر کچھ ہی دیر میں فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھالیا تو شیخ صاحب خود بول رہے تھے۔

''کیا آپ کے ہِرنوں کی صرف تین ہی ٹانگیں ہوتی ہیں۔ چوتھی کہاں گئی''

وزیراعظم بخشی غلام محمد جشن کشمیر کی افتتاحی تقریب میں
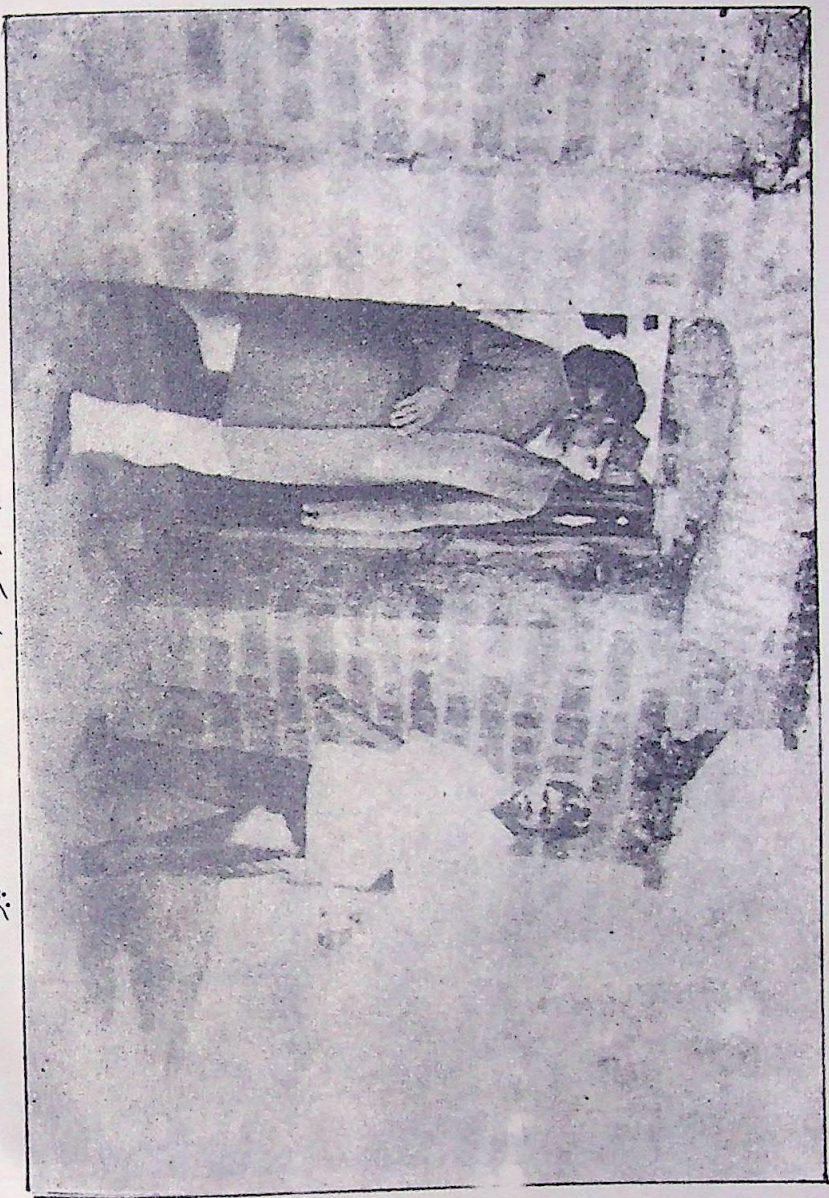
بخشی صاحب اس زندان خانے کو دیکھنے بھی گئے جہاں انہوں نے
سولہ مہینے کی قید کاٹی

بخشی صاحب...... اپنی مدد آپ!

جھیل وُلر کے احیاء کیلئے اقدامات

اور پھر قہقہہ لگایا۔ بخشی صاحب نے کہا کہ میں نے ذرا ندامت سے جواب دیا

"ہتہ حض۔ ژورِم زنگ اُسس لنڈ ٔ مے دوپ تو ہہ ماگرژھ وِشگ......

(حضرت چوتھی ٹانگ میں لنگ تھا۔ میں نے سوچا کہیں آپ اِسے اچھا شگون نہ سمجھیں)۔

بخشی صاحب کے کہنے کے مطابق شیخ صاحب بولتے گئے۔

"شگ گیہ بیزار...... مسلمانن چُھنہ گرژھان، میوّن شکار رُوُدے باقی"۔

(شگون وگون بیکار کی باتیں ہیں۔ مسلمان ایسا نہیں مانتے۔ مگر میرے شِکار کا تقاضہ باقی رہا)

بخشی صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا "جنگلہ کس سہُس تہٕ آسہ نہٕ ییژ......(جنگل کے شیر کو بھی اِتنی......نہیں ہوگی)

بخشی غلام محمد نے اِس کے بعد اچھے دن نہیں دیکھے۔ اُن کی صحت خراب ہوگئی وہ ایک الیکشن ہار گئے۔ شیخ صاحب کے ساتھ تعلقات پھر بگڑ گئے اور اُنکے سیاسی ستارے گردش میں رہے۔ جو شخص غریب پروری اور سخاوت پناہی کا مُجسمہ تھا اس نے دُنیا کے دستور کے مطابق لوگوں کی آنکھیں بدلتی ہوئی دیکھیں۔ انہی دنوں کا ذکر ہے (مجھے سَن پوری طرح یاد نہیں) میں بکر عید کے روز علی الصبح اُن کو سلام کرنے کیلئے گیا۔ وہ اُن دنوں شیو پورہ کے اُسی مکان میں رہتے تھے جہاں اُنکا انتقال ہوا۔ بہت خوش ہوئے۔ لیکن گھر میں نوکروں کے سِوا کوئی ریل پیل نہ تھی۔ میں نے صرف اُن کے نائی کو آتے دیکھا جسے انہوں نے قہوہ پلا کر عیدی سے نوازا۔ لیکن اُنہوں نے مجھے رُخصت نہیں دی۔ وہ کہتے رہے کہ عید کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ اور اتنی محبت سے کہا کہ میں پگھلا جا رہا تھا۔ میں نے بہت عاجزی سے کہا "حضرت میرے بیوی بچے

انتظار کر رہے ہوں گے عید کے دن گھر......" لیکن وہ بناوٹی غصہ کر کے بولے "چپ۔ ورنہ میں تمہیں قربانی کا بکرا بنادوں گا" (بہ کرتہ قوربان)۔ شفقت کی اِس سونامی (Tsunami) کے آگے میری کیا مجال تھی۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ انکی نظریں بار بار دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں......ذرا آہٹ ہوتی تو وہ اُٹھ کھڑے ہوتے۔ وہ بہت سے مہمانوں کی راہ تک رہے تھے کہ سبھوں کے ساتھ کھانا انکی عادت تھی۔ مگر وہ خلیل خان فاختہ اُڑا کر چلے گئے تھے۔ مجھے فیضؔ یاد آگیا ؎

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

بہر حال ہم دوؐ نے وازہ وان کھانے کیلئے بِسم اللہ کی۔ بخشی صاحب صاف طور بُجھے بُجھے لگ رہے تھے۔ بہر حال بسم اللہ ہوئی۔ بخشی صاحب بہت کم خور تھے اور پھر پرہیز کی تاکید۔ چند ضیافتوں کو بس ہاتھ لگایا اور انگلیوں کو چکھا۔ مگر مجھے پوری شفقت سے کھِلاتے رہے۔ ٹیبل پر کھانا تقریباً اَن چھوا رہ گیا۔ بقول لل دید

بُری بُری بانہ تہ کھیواں نہ کونہ ژھ

(برتن بھرے ہوئے ہیں مگر کوئی کھانے والا نہیں)

اور پھر ۱۵ ر جولائی ۱۹۷۲ء کا وہ دن......صبح میں اَخباروں میں شیخ محمد عبداللہ صاحب کی وہ تقریر پڑھ رہا تھا جو انہوں نے ۱۳ ر جولائی کو مزار شہداء پر کی تھی۔ اس میں اور باتوں کے علاوہ بخشی صاحب پر بھی تنقید تھی۔ اِتنے میں ٹیلی فون پر کسی دوست نے بخشی صاحب کے رحلت کر جانے کی اندوہناک خبر سنائی۔ میرا دل جیسے بیٹھ ہی گیا۔ وہ اِس دن ختمِ ہفتہ کیلئے پہلگام کی تیاری کر رہے تھے۔ ضیافتوں کے دیگچے گاڑی میں رکھوائے گئے تھے۔ وہ حجامت بنا کے اور نہا دھو کے فارغ ہوئے تھے۔ فجر کی نماز کے بعد بستر پر ٹیک لگائی اور وہیں سے اپنے مولیٰ کا راستہ اختیار

کرلیا۔انا للہ و انا الیہ راجعون۔میں دوپہر کے بعد اپنے دوست اور بخشی صاحب کو الیکشن میں شکست دینے والے شمیم احمد شمیم کے ساتھ ان کے آخری دیدار کیلئے گیا۔بخشی صاحب کا جسد زیارت کیلئے رکھا گیا تھا۔ہونٹوں پر تبسُّم تھا اور چہرہ بالکل صِفاچٹ۔میں نے اُچٹی ہوئی نظر ڈالی تو ان کی سخاوتوں اور رعنائیوں کے جوق در جوق واقعات افقِ ذہن پر سفید پرندوں کی قطاروں کی طرح اُڑنے لگے۔وزیر اعلیٰ میر قاسم رنجیدہ بیٹھے تھے۔اِتنے میں ان کے پہلے رفیق اور پھر رقیب مولانا محمد سعید مسعودی تشریف فرما ہوئے۔بخشی صاحب کے چہرے پر نظر ڈالی اور بے ساختہ طور کہا۔"ارے بخشی صاحب ہمیں چھوڑ کر کہاں چلے ہو۔اب ہم کس کے ساتھ لڑیں گے"۔سارے لوگ آبدیدہ ہو گئے۔ان کی نماز جنازہ خانقاہِ معلیٰ کے احاطے میں اَدا کی گئی اور پھر انہیں اِسی مُتبرک اَحاطے میں سپرد خاک کیا گیا۔کشمیر نے ایک ایسی شخصیت کو کھو دیا تھا جس کی نظیر صدیوں تک نظر نہیں آئیگی۔

پہنچتی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

☆☆☆

پرتھوی راج کپور

اَپنے بخشی صاحب

میں بخشی غلام محمد سے پیار کرتا ہوں۔ کیونکہ ان میں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ وہ خاص بات جو ایک آدمی کو عام آدمیوں سے الگ الگ سا، پرلے پرلے سا، اوپرا، اور پراسرار کھے غیر بنادے پرایا کردے۔ جس سے ملنے سے آپ کو ہچکچاہٹ سی ہو۔ دہشت پیدا ہو، گھن آنے لگے جس کے قریب جاؤ تو محسوس ہونے لگے کہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ رہے ہیں۔ سانس پھول رہی ہے۔ دَم نِکلنے کو ہے۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے اُن میں۔ بخشی صاحب اِس دیش کے عام آدمیوں میں سے ایک ہیں۔ اِس دیش کے تمام آدمیوں کا سارنگ رُوپ۔ عام آدمیوں کی سی ڈیل ڈول۔ عام آدمیوں کی سی بے نیازی ہے۔ بھول پن ہے۔ کوئی تصنع نہیں۔ بناوٹ نہیں۔ پھُوں پھَاں نہیں۔ ٹھونس ٹھانس نہیں۔ بات چیت کا بھی عام آدمیوں کی سی۔ کوئی ڈکشنری، شبد کوش یا لغات میں سے رَٹے ہوئے لفظ نہیں ہیں۔ ان کی بول چال میں کہ جن کے بولتے ہوئے ایک بھلا چنگا آدمی بھی ہوں معلوم ہونے لگے کہ بخار کے زیرِ اَثر بلبلا رہا ہے۔ ہیجان بک رہا ہے۔ رام جانے کیا کہہ رہا ہے کیوں کہہ رہا ہے۔ کس لئے کہہ رہا ہے اور کس کیلئے کہہ رہا ہے۔

نہیں یہ سب باتیں نہیں ہیں ان میں اور نہ ہی وہ باتیں ہیں جو
در بھاگیہ وش۔ بد قسمتی سے چند لیڈروں میں پیدا ہو جاتی یں۔ جو لیڈر بننے کیلئے
عوام کے پاؤں تلے ہتھیلیاں بچھاتے پھرتے ہیں اور جب ان کے ووٹ حاصل
کر کے لیڈر بن جاتے ہیں تو پھر انہیں لوگوں کے سروں پر پاؤں رکھ کر چلتے ہیں۔
انہیں روندتے ہوئے مسلتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

نہیں ان میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ہے کوئی بات تو وہی جو اِس
دھرتی کے عام آدمیوں کی خاص باتیں ہیں اور جو خاص باتیں آج ہم میں عام طور پر
کم نظر آتی ہیں اور جن کے کم ہونے کی وجہ سے ہم اپنی یوجناؤں کو پوری طرح پورا
نہیں کر پارہے ہے اور نہ ہی اِس دیش کے مہان آتماؤں کی قربانیوں کے پھل سروپ
حاصل کی ہوئی آزادی کا پورا پورا لابھ پوری طرح اُٹھا پارہے ہیں۔

پر بخشی صاحب جیسے آدمیوں کو دیکھ کر ڈھارس بندھتی ہے۔ حوصلہ بلند ہوتا
ہے۔ دیش کے مہان نیتاؤں کے دیکھے ہوئے خواب۔ سوچے ہوئے نقوش
حقیقت کے سانچے میں ڈھلے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان میں وہ عام اور تمام باتیں
ہیں جو اِس دیش کے جن سادھارن کی۔ عام آدمی کی بنیادی باتیں ہیں۔ جن پر اس
مہان اور پراچین دیش کی عمارت کھڑی ہے اور ہزاروں طوفان سر پر سے گزر
جانے کے بعد بھی کھڑی رہی ہے۔ اور کھڑی رہے گی۔ وہ ہیں اِس دیش کا
آتتھیہ۔ اِس کی مہمان نوازی، سادگی اور سادہ دِلی، پیسے والے سے بڑھ کر گنی
اور ودوان، عالم اور ہنر مند کی عزت کرنا، زور اور زبردستی کے آگے نہ جھکنا اور پیار
اور نیکی کی قدر کرنا اور سب سے بڑھ کر اس دیش کی مٹی سے پیار۔ وہ مٹی جسے بڑوں
نے رتن گر بھا کہا ہے جو گنج ہے خزانہ ہے بیش بہا علم و فن کا۔ وِدیا اور ہنر کا

مجھے بخشی صاحب کی باتوں میں، ان کے ہر قول اور فعل میں، آچار اور ویوہار میں دیش کی مٹی کی بھینی بھینی سگندھ، میٹھی میٹھی خوشبو ملتی ہے اور اس مٹی کا پیار ملتا ہے۔اِسی لئے میں ان سے پیار کرتا ہوں۔ (ماخوذ)

تہنیتِ رشید

(بموقعِ سالگرہ بخشیؔ عالی قدر)

۱۹۶۰ء

قابلِ فخرِ وطن ہے اِس زمانے کیلئے
ذاتِ والا خالدِ کشمیر خوش اقبال کی
حق نے بخشی ہے انہیں طبع رسا فکرِ جواں
زندگانی خود ہے شاہد خوبیٔ اعمال کی
جنم دن پر ذرّہ ذرّہ دے رہا ہے یہ دعا
خیر ہو اِس مادرِ ہندوستان کے لال کی
کیوں نہ انورؔ کی ہو یہ تاریخ مشہور جہاں
ہوگئی عمرِ مبارک اَب ترپن سال کی

انورؔ صابری

کوہ صفت

آبشاروں کی رَوانی ہے تری طبعِ رَسا
تیری فطرت میں فلک بوس پہاڑوں کا جلال
حوصلے تیرے بلند، اور بلند اور بلند
غیر ممکن نہیں تیرے لئے کوئی بھی سوال
تیری محنت سے، ترے ذوق چمن بندی سے
کِھل رہے ہیں مرے کشمیر میں گلہائے خیال
عزم نے تیرے پہاڑوں کو دھنک ڈالا ہے
یہ ٹنل ہے ترے خوش رنگ اِرادوں کا جمال
یہ ہے آئین، ترے عہد کا شہکار حسیں
اور یہ بھی تری ثابت قدمی کا ہے مآل
کامیابی کوئی راہ گذر بخشی ہے
ایک اِک گام تری راہبری کا ہے کمال

●●●

محمد آصف

نذرِ خالد کشمیر

تو نے خوابوں کو بنایا ہے حقیقت جب سے
لب پہ بھولے سے نہ آیا کبھی تعبیر کا نام

تیری باتوں میں وہ جادو ہے کہ مبہوت ہیں سب
اور دیوانے ہیں بھولے ہوئے زنجیر کا نام

تو نے خوشحال بنایا ہے تو سب ہیں خوشحال
اَب مقدّر کے ہیں شکوے نہ ہے تقدیر کا نام

تصفیہ تجھ سے کراتے ہیں اگر ہو رنجش
کوئی لیتا ہی نہیں خنجر و شمشیر کا نام

عزم نے تیرے اولوالعزم بنایا سب کو
دل کی محراب پہ ہے خالدِ کشمیر کا نام

●●●
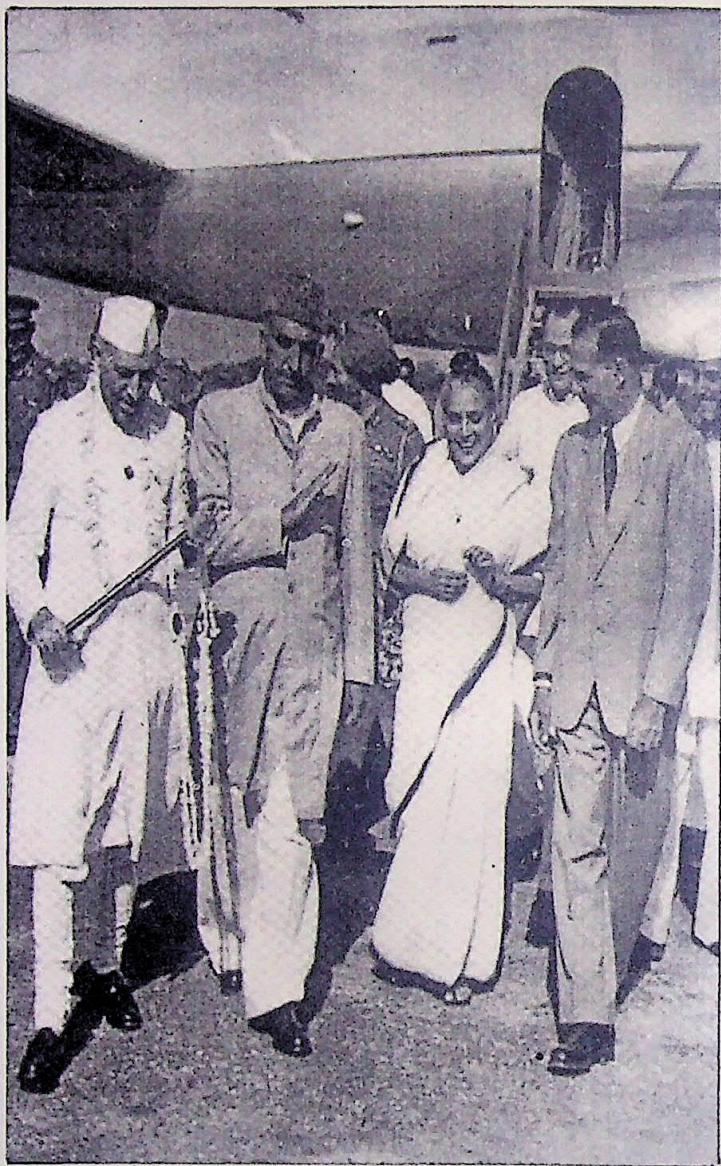
پنڈت جواہرلال نہرو کا اِستقبال

پنڈت نہرو، ڈاکٹر کرن سنگھ اور بخشی صاحب

پنڈت نہرو......بخشی غلام محمد

پنڈت نہرو اور بخشی صاحب - قدیم دستاویزات کا مطالعہ

غلام نبی خیالؔ

بخشی غلام محمد............میری نظروں میں

بخشی غلام محمد سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۴ء میں ہوئی۔ حکومت ہند نے ۹/اگست ۱۹۵۳ء کو اس وقت کی ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کی سرکار کو برخاست کرنے کے بعد انہیں گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا تھا اور بخشی صاحب ان کے بعد اِس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے تھے۔

میں نے اُنہی دنوں اِسلامیہ ہائی سکول سرینگر سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا اور اِس وجہ سے سرکاری نوکری تلاش کرنے پر مجبور کیا گیا تھا کہ میرے بزرگوں کا یہ خیال تھا کہ میں پڑھائی سے زیادہ آوارہ گردی میں بیشتر وقت ضائع کرتا ہوں۔ لہٰذا مجھے تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھانے کے بجائے ملازمت میں جانا چاہئے تا کہ میں نظم وضبط میں رہ کر کام کرسکوں۔

میں نے سنا تھا کہ وزیر اعظم بخشی صاحب ہر جمعہ کو صبح سے لے کر نماز تک ایک دَربار عام سجایا کرتے تھے جس میں وہ مولانا آزاد روڈ پر واقع پرائیویٹ آفس کے وسیع وعریض ہال میں عام لوگوں کی حکایات وشکایات سنا کرتے تھے اور کبھی کبھی موقعہ پر ہی ان کے عملی حل کیلئے احکامات صادر کیا کرتے تھے۔

اپنے والدین اور بزرگان خانہ کی ضد کے نتیجے میں میں بھی ایک جمعہ کو بخشی

صاحب سے ملنے کی غرض سے اُن کے دربار میں پہنچا تا کہ اُن سے بادلِ ناخواستہ کسی مناسب نوکری کی درخواست کروں۔

بخشی صاحب غالباً اُس روز جلدی میں تھے۔ اِسی لئے وہ کھڑے کھڑے لوگوں سے عرضیاں اور درخواستیں لے کر انہیں اُپنے پرائیویٹ سیکرٹری روگھناتھ وار کے حوالے کرتے ہوئے انہیں ضروری ہدایات بھی دے رہے تھے۔

میں اُن کے قریب گیا اور سلام کر کے اُپنا تعارف کرایا۔ میں نے اُن سے کہا کہ ''میں نے حال ہی میں میٹرک پاس کر لیا ہے اور مجھے نوکری چاہئے''۔ بخشی صاحب نے ایک چبھتی ہوئی نظر میرے سراپا پر ڈالی اور اَپنے دائیں طرف کھڑے پولیس افسر سید نذیر احمد شاہ المعروف شیام جی سے کہا ''شیام جی۔ اِسے پولیس میں لگادو۔ اِس کا دراز قد پولیس کیلئے موزوں ہے''۔ شیام جی نے کہا ''بہتر جناب'' اور مجھ سے ایک پولیس والے کے تُرش لہجے میں کہا ''کل میرے دفتر میں آجانا۔ میں تمہیں آرڈر دوں گا''۔ میں نے قدرے توقف کے ساتھ بخشی صاحب کا شکریہ اُدا کیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ دال نہیں گلنے والی ہے۔

جب میں گھر پہنچا تو میں نے گھر والوں کو یہ بشارت دی کہ مجھے نوکری مل گئی ہے اور وہ بھی پولیس میں۔ میرا یہ کہنا ہی تھا کہ گھر میں گویا ایک ہلچل سی مچ گئی۔ ہمارا کنبہ اُس وقت چوبیس پچیس اُفراد پر مشتمل تھا لیکن سب سے زیادہ اس گھر میں میرے مرحوم ماموں میر عبدالعزیز کی چلتی تھی۔ میر صاحب میری بات سن کر آگ بگولہ ہو گئے اور انہوں نے چلا چلا کر کہا ''کیا ہمارے گھر کا لڑکا پولیس میں نوکری کرے گا؟ ہمارا گھر میر خاندان کا گھر ہے اور اِس محلے میں سب سے باعزت اور محترم گھر ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا''۔ پھر تیوریاں چڑھا کر مجھ سے کہا، ''غلام نبی، خواہ کچھ بھی ہو تم پولیس

میں نہیں جاؤ گے۔ یہ ہمارے گھر کیلئے باعث ذلت ہوگا“۔

میں خاموش رہا اور فوراً ہی مجھے ایک ایسا واقعہ یاد آ گیا جو پولیس کے محکمے سے ہی متعلق تھا اور صرف چند روز پہلے پیش آیا تھا۔ ہمارے محلے میں ایک چھُری مارنے کے واقعے کی تحقیقات کے سلسلے میں پولیس کی ایک جماعت نے ہمارے گھر کے باہر ایک کھلے میدان میں اپنا ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ اِس تحقیقات کی نگرانی قلعہ ہاری پربت کے دامن میں آباد بوٹہ راجوں کے قبیلے کا ایک فرد راج ولی کر رہا تھا جو پولیس میں حوالدار کے عہدے پر فائز تھا۔ ایک بار ہم نے اس سے پوچھا کہ آپ کی وردی پر جو JKP کا بَلا لگا ہے اس کے کیا معنی ہیں؟ راج ولی نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، ”بیٹا اسکے معنی ہیں جیو کھاؤ اور پیو“۔ یہ سُن کر میرے ذہن میں پولیس کے بارے میں عجیب و غریب سوالات پیدا ہوئے تھے کہ کیا ہماری پولیس جینے، کھانے اور پینے کیلئے ہی کام کر رہی ہے؟ اور اَب اس پولیس محکمے کے ایک کارکن کے طور پر کام کرنا مجھے بھی معیوب سا لگنے لگا اور میں نے میرؔ صاحب کی ہدایت پر عمل کر کے پولیس کی ملازمت کا خیال ہمیشہ کیلئے دِل سے نکال دیا۔

دَر بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ریڈیو کشمیر میں اَناؤنسر اور نیوز ریڈر کی ایک جگہ خالی ہوگئی۔ اِس واحد جگہ کیلئے ۱۹ اُمیدوار میدان میں تھے جن میں میرے علاوہ مرحوم امیش کول اور مرحوم مکھن لال بیکس بھی شامل تھے۔ پروفیسر جیالال کول اور مس محمودہ احمد علی شاہ نے جب ہمارا آڈیشن لیا تو یہ نوکری مجھے مل گئی کیونکہ ان کے بقول، کشمیری اور اُردو میں میرا تلفظ بھی بہتر تھا اور میری آواز بھی ریڈیو کیلئے موافق تھی۔

ریڈیو کی ملازمت اختیار کرنے کے ساتھ ہی کشمیر کی ترقی پسند ادیبوں کی

تحریک کے ساتھ میرا رشتہ مضبوط تر ہوتا گیا کیونکہ اس وقت ریڈیو میں کئی ترقی پسند شاعر اور ادیب کام کر رہے تھے جن میں علی محمد لون، بنسی نردوش، سہیل عظیم آبادی، پران کشور، اکبر لداخی، پشکر بھان وغیرہ شامل تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کو اَب کلچرل کانفرنس کا نام دیا گیا تھا اور میں ہر جمعہ کو ہونے والی اس کی ہفت روزہ نشستوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اِس وقت کے وزیر تعلیم غلام محمد صادق کانفرنس کے فعال سرپرست تھے جو خود بھی ترقی پسند خیالات کی وجہ جانے پہچانے جاتے تھے۔

۱۹۵۷ء میں جب صادق صاحب اور اُن کے ہم خیال ریاستی کابینہ کے وزیر سید میر قاسم، درگا پرشاد دھر اور گردھاری لال ڈوگرہ، بخشی صاحب کے ساتھ سیاسی اختلافات کے نتیجے میں سرکار سے الگ ہوگئے اور اُنہوں نے اپنی نئ تنظیم ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس قائم کرلی تو کلچرل کانفرنس کے اراکین بھی 'کمیونسٹوں کے ایک ٹولے' کی شکل میں بخشی سرکار کی آنکھ کا خار بن گئے۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں جب شیخ محمد عبداللہ کو قید سے عارضی رہائی ملی تو میں بھی انکے جلسوں میں ان کی تقریریں سننے کی خاطر اپنی سرکاری ڈیوٹی سے بھی آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔ میری اس حرکت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور بالآخر مجھے فروری ۱۹۵۸ء میں حضرت بل قتل کیس نامی ایک فرضی مقدمے میں ملوث کر کے گرفتار کیا گیا اور پورے دو سال سنٹرل جیل سرینگر میں گزارنے کے بعد مجھے رہا کیا گیا لیکن حضرت بل مقدمہ ابھی قائم تھا اور میری رہائی ضمانت پر ہوئی تھی۔

۱۹۶۰ء میں اپنی رہائی کے بعد جب میں نے جیل خانے کے اُپنے شب و روز پر ایک نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ اس دوران میں نے مولانا محمد سعید مسعودی اور حسام الدین بانڈے کی عنایت سے فارسی زبان بھی سیکھ لی تھی اور عمر خیام کی

فارسی رباعیات کا منظوم کشمیری ترجمہ بھی مکمل کرلیا تھا اور اس کے علاوہ میری جیل خانے میں تخلیق شدہ کشمیری نظموں کا ایک مجموعہ بھی اشاعت کیلئے تیار تھا۔

بخشی صاحب نے میری رہائی کے بعد ایک روز اُپنے پرائیویٹ سیکرٹری آرسی رینہ کے ذریعہ مجھے یہ پیغام بھجوایا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ جب میں ان سے مولانا آزاد روڑ واقع وزیراعلیٰ کی پرائیویٹ رہائش گاہ کے احاطے میں ملاقی ہوا تو انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میری نظر بندی کے حوالے سے یہ انکشاف کر کے بذات خود معافی مانگ لی کہ اِس حرکت کے پسِ پردہ اُن کے بھائی بخشی عبدالرشید کا ہاتھ تھا جسے میری سرگرمیوں کے بارے بے بنیاد اور من گھڑت اطلاعات دی گئی تھیں۔ بخشی صاحب نے یہ بھی کہا کہ جب انہیں اِس بات کا پتہ چلا تو انہوں نے میری فوری رہائی کیلئے چند قانونی ماہروں سے مشورہ کیا جنہوں نے یہ کہہ کر اس تجویز کی مخالفت کی کہ ایک نظر بند کی اچانک رہائی سے حضرت بل کیس کی ساری بنیادیں ہِل جائیں گی اور قانونی لحاظ سے یہ مقدمہ کمزور پڑ جائیگا۔ لیکن بخشی صاحب نے ان کی ایک بھی نہ مانی اور بذاتِ خود میری رہائی کی ہدایات جاری کیں۔

بخشی صاحب تک نہ جانے کن خاص ذرائع سے یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ میں نے نظر بندی کے دوران عمر خیام کی رُباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ اس ملاقات میں انہوں نے میری اس کاوش پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔

"امرت بازار پتریکا" کے نامہ نگار کے ایل شریدرانی نے شاید اس پس منظر میں بخشی صاحب کی پسند کے بارے میں لکھا تھا کہ "بخشی صاحب عمر خیام کو پسند کرتے ہیں اور کشمیر کی آب و گل کی پیداوار ہے لیکن شیخ عبداللہ اقبال کو پسند کرتے ہیں جس نے کہ لفظ پاکستان کی اختراع کی (۱) اور جو پنجابی سیاست کی پیدوار ہے"۔

بخشی صاحب نے مجھ سے کہا ''غلام نبی! تم ایک ابھرتے ہوئے دانشور ہو۔ سیاست گری تمہارا کھیل نہیں اور جیل میں دو سال تک رہنے کی وجہ سے تمہارے گھر کی مالی حالت پر بھی برا اثر پڑا ہوگا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم نوکری کرلو اور میں کلچرل اکادمی میں تمہیں ایک اچھی جگہ پر فائز کرلوں گا''۔ اس کے فوراً بعد انہوں نے پانچ سو روپے مجھے دیئے اور تاکید کی کہ عمر خیّام کا ترجمہ فوراً کتابی صورت میں شائع ہونا چاہیئے۔ جب اِس کتاب کی پانچ سو جلدیں چھپ گئیں تو پانچ سو روپے میں سے ڈیڑھ سو روپے بچ گئے تھے۔ میں یہاں پر بخشی غلام محمد کی اِس اَدائے دِلبری کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہی قتل بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

بخشی صاحب نے جب مجھے کلچرل اکادمی میں ملازمت دِلوائی تو اِسی دوران ہماری قانون سازیہ کونسل کے ایک رُکن اور کشمیری شاعر دینا ناتھ نادؔم نے ایک روز ایوان میں یہ سوال اٹھایا کہ ایک بہت بڑے مقدّمے میں ملوث ایک ملزم کو وزیرِاعظم نے کس طرح سرکاری ملازمت دلوائی۔ نادؔم صاحب کا یہ سوال سُن کر بخشی صاحب کھڑے ہوگئے اور برافروختہ ہوکر دینا ناتھ نادم سے مخاطب ہوئے اور اپنی گرج دار آواز میں کہا۔ ''دینا ناتھ! اس ریاست کا وزیرِاعظم میں ہوں۔ تم نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اُپنی نشست پر بیٹھ جاؤ''۔ نادؔم صاحب کی بولتی بند ہوگئی اور پھر انہوں نے دوبارہ اس بات کو چھیڑنے کی جسارت نہیں کی۔

اکادمی میں چار سال تک میں شعبہ مطبوعات کے سربراہ کی حیثیت میں کام کرتا رہا اور اس دوران مجھے مرزا کمال الدین شیؔدا، علی جواد زیدی، صاحبزادہ حسن شاہ،

(۱) شریدرانی کا یہ مفروضہ تاریخی اعتبار سے بے بنیاد ہے (خیاؔل)

نورالدین اور پروفیسر جیالال کول جیسے تجربہ کار اور معتبر سیکرٹریوں کی شفقت اور رہبری کا فیضان حاصل ہوتا رہا۔

اس کے بعد میں بخشی غلام محمد سے کبھی کبھار ہی ملتا رہا اور یہ مختصر ملاقاتیں مشاعروں یا ثقافتی تقریبات کے موقعہ پر ہُوا کرتی تھیں۔

عمر خیام جب کتابی شکل میں شائع ہوئی تو میں ایک عید کی صبح اس کی پہلی جِلد بخشی صاحب کو پیش کرنے کی خاطر اور ساتھ ہی عید مبارک دینے کی غرض سے پرائیویٹ آفس پہنچا جہاں ریاست کے اَرباب ِحل وعقد انہیں مبارک باد دینے کی غرض سے پہلے ہی جمع ہو چکے تھے۔ یہ کتاب ہاتھ میں لے کر اُن کے چہرے پر ایک بشاشت سی پھیل گئی اور انہوں نے حاضرین میں موجود کشمیری شاعر غلام نبی فراؔق سے کہا کہ وہ اَپنے مخصوص ترنّم میں چند رباعیات سنائے۔ فراؔق نے واقعی ایک سماں باندھ لیا جس کی سریلی گونج آج بھی میرے فکر و ذہن میں تروتازہ ہے

۱۵/جولائی ۱۹۷۲ء کو جب بخشی صاحب کا انتقال ہوا تو اِس کے چند روز بعد ان کی اہلیہ محترمہ بیگم خورشید المعروف سی سی نے آبدیدہ ہو کر مجھ پر یہ انکشاف کیا کہ ”جب بخشی صاحب نے آخری سانس لی تو ہم نے دیکھا کہ ان کے سرہانے کے نیچے آپ کی عمر خیام کی ایک جِلد رکھی ہوئی تھی“۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

●●●

ایس۔ پی ساہنی

عوام کے چہیتے رہنما۔ بخشی صاحب

شادی پور کے نزدیک ایک گاؤں کی سڑک کے کنارے لوگوں کی ایک جماعت کھڑی تھی۔ بخشی صاحب نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ کار کو اُن کے نزدیک روکے۔ ساری فضا خوش آمدید کے ان نعروں سے گونج رہی تھی۔ خالدِ کشمیر زندہ باد۔ بخشی وَزارت زِندہ باد، وغیرہ۔ اِسکے باوجود چہروں پر اضطراب کے آثار نمایاں تھے اور ماحول جذبات سے پُر تھا۔

جہلم میں باڑھ آنے کی وجہ سے سارا گاؤں خوف زدہ ہو رہا تھا اور آس پاس کے علاقے پہلے ہی سے گھبرائے ہوئے تھے۔ جن علاقوں میں کسی قسم کا خوف و ہراس ہو وہاں بخشی صاحب کا یکا یک طور پر وارد آنا کوئی نئی بات نہیں لیکن اس گاؤں تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ بخشی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اِس لئے وہاں کے باشندے ان سے ملنے کیلئے سڑک پر جمع ہو گئے تھے تا کہ وہ ان سے ٹاٹ کی باریوں، بیلچوں، چٹائیوں اور لالٹینوں کی درخواست کریں۔

وہ اپنی کار میں بیٹھے اور ان کی آہ وزاری سُنتے رہے۔ اُن کا ردعمل فوری اور سچّا تھا۔ بخشی صاحب اِس صورت میں اُن کی مدد کرنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ امید سے ہاتھ دھو بیٹھ کر مایوسی کی کیفیت میں رہیں وہ انہیں ہر قسم کی سہولیت بہم پہنچائیں گے

بشرطیکہ وہ چیخنا چلانا بند کردیں۔ عالم مجبوری سے نکل آئیں اور اپنا اپنا گاؤں بچانے اور آس پاس کے رقبہ کی حفاظت کرنے کیلئے ہی اپنا مُنہ کھولیں۔ اِس سے اُن کی ہمت بندھی اور انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کانا پھوسیوں میں باتیں کرنا شروع کیں۔ دَم زدَن میں ایک شخص راستہ نکالتا ہوا بخشی صاحب کے سامنے آیا اور ان سے کہنے لگا کہ میں رات بھر جاگ کرتن تنہا کام کروں گا۔ اس کے بعد دیگر اشخاص نے بھی اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا۔

بخشی صاحب کار سے باہر نکل آئے اور کیچڑ سے بھرے ہوئے راستے سے ہوکر جہلم کے بندھ کی طرف جانے لگے۔ انہوں نے خطرناک حصوں کا معائنہ کیا اور متعلقہ انجینئروں کے نام احکامات جاری کئے کہ وہ اُن جگہوں کی دُرستی کی طرف فوری توجّہ دیں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ اپنی مدد آپ کریں اور ساتھ ہی انہیں اِس بات کا یقین بھی دلایا کہ وہ اِسی رات کو واقعات کا جائزہ لینے اور کئے گئے کام کو دیکھنے کیلئے دُوبارہ آئیں گے۔ ہم نے اس رات بھی اِس جگہ کا معائنہ کیا اور بخشی صاحب یہ دیکھ کر مطمئن ہو گئے کہ لوگ لالٹینوں کی روشنی میں پورے جوش وخروش کے ساتھ کام میں لگے ہیں۔ اُنہوں نے کمزور جگہوں کو مضبوط بنایا تھا اور انجینئروں کا ایک عملہ ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اِس طرح سے یہ گاؤں اور اِرد گرد کے علاقے محفوظ ہو گئے تھے۔

صرف ایک ہی واقعہ سے جو کئی سال پہلے رونما ہوا اور جو بخشی صاحب کے رازِ عمل کی تصویر کشی کرنے میں ممد ثابت ہوگا۔ خود بھی ایک باعمل انسان ہونے کے ناطے عظمت عمل میں چار چاند لگاتے ہیں اور خود اعتمادی کی حِس کو بیدار کرتے ہیں۔ اس طریقے کو ترقیاتی سرگرمی کے تقریباً ہر ایک میدان میں ایک شاندار

کامیابی کے ساتھ رُوبہ عمل لایا گیا ہے۔ گو یہ طریقہ نہ تو انوکھا ہی ہے اور نہ ہی ان کی اختراع لیکن موجودہ حالات میں بخشی صاحب کی طرف سے اس کے اطلاق نے موثر بلکہ بعض اوقات تو انتہائی شاندار نتائج پیدا کیئے ہیں۔

دُوسرا ایک واقعہ بھی میرے ذہن میں آتا ہے جو اس مرغوب کن حافظ کی تصویر کشی کرتا ہے جس کا مالک عوام کا یہ محبوب شخص ہے۔

میں تحصیل پلوامہ کے ایک دَورے میں انکے ہمراہ تھا۔ ہم ایک گاؤں میں پہنچے جہاں انہیں ایک مجمع سے خطاب کرنا تھا جیسا کہ ان کا معمول ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی شکایات پیش کرنے عام اجازت دیتے ہیں اور اُن سے ملاقات کرنے کی مختلف دَرخواستیں ان کے پاس آتی ہیں۔ ایک بوڑھا آدمی روتا ہوا ان کے پاس آیا۔ اس کے بیٹے کی آنکھیں کسی مرض میں مبتلا تھیں اور اُسے یہ خوف تھا کہ اس کا بیٹا اپنی بینائی کھو بیٹھے گا۔ اُن دنوں اس علاقے میں امراضِ چشم کا کوئی ماہر موجود نہ تھا۔ اِس لڑکے کو ایک گاڑی میں سرینگر لا کر سرینگر کے سول اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ کچھ سال بعد بخشی صاحب وزیرِاعظم کے ہمراہ اسی تحصیل کے دَورے کا پھر اِتفاق ہوا اور انہوں نے اسی علاقے میں قیام کیا۔ معمول کے مطابق لوگوں کا ایک اَنبوہ اُن کے گِرد جمع ہوا۔ انہوں نے جونہی مذکورہ بوڑھے کو دیکھا تو اِشارہ کر کے اس کا نام لے کر اُسے بُلایا اور یہ پوچھا کہ آیا اِس کا بیٹا پوری طرح شفایاب ہوا ہے یا نہیں۔ بوڑھے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ اس کا بیٹا اب صحت یاب ہوا ہے اور اسکول جاتا ہے۔ اِس لڑکے کو بھی وزیرِاعظم کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایک ایسا وزیرِاعظم جو پہلے ہی گوناگوں مسائل میں مصروف ہو اور جس کیلئے ہفتہ ہزاروں لوگوں سے ملنا جلنا ہو ایک عام آدمی کا نام

یاد رکھے اوراس کی کسی خاص مشکل کو باوجود یکہ کئی برس گزر جانے کے بعد بھی فراموش نہ کرے۔ بخشی صاحب کا یہ خاص وصف ہے کہ وہ غیر معمولی انتظامی اُمور سے متعلق حقائق، اعداد وشمار اور تاریخوں کے بارے میں اپنے حیرت انگیز حافظہ سے کام لیتے ہیں اور ہمارے سامنے کوئی ایسا واقعہ نہیں جہاں ان کی یادداشت ذرّہ بھر بھی غلط یا نادرست ثابت ہوئی ہو۔

میں نے کئی برسوں تک ان کے ساتھ ساری وادی کا دَورہ کیا ہے وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں چاہیئے وہ کوئی دُور افتادہ یا غیر منقطع علاقہ ہی کیوں نہ ہو۔ وہاں کے اکثر سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں کو آپ ذاتی طور جانتے ہیں۔ بخشی صاحب انہیں نام سے بُلاتے ہیں اوراُن سے ان کی بہبودی، ان کے گھرانوں اورمَسائل کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اَپنے آپ کواُن کا محبوب بناتے ہیں۔ لوگوں کواِس بات کا اطمینان ہے کہ اِن کے وزیر اعظم ان کی بہبود میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اِسی ناطے تمام وادی کے لوگوں سے ان کا رابطہ گہرا دیرپا اور ذاتی بن کے رہ جاتا ہے۔ الغرض وہ پورے طور پر عوامی رہنما تھے۔

وہ قصبوں، دیہاتوں، وادیوں اور پہاڑوں کا دورہ کرتے ہیں ان کے ساتھ عام طور پر متعلقہ علاقے سے وابستہ ایک یا دو وزیر قانون سازیہ میں اس کا نمائندہ، ضلع کا ڈپٹی کمشنر، سپرانٹنڈنٹ پولیس، پبلک ورکس، محکمہ آبپاشی کے چیف انجینئر، محکمہ جنگلات کے چیف کنزرویٹر، ناظم تعلیمات اور محکمہ مال، کواپریٹو، زراعت اور خوراک کے اعلیٰ افسران جایا کرتے ہیں۔ کسی جگہ پہنچنے پر بخشی صاحب مقامی رہنماؤں اور لیجیسلیچرز کے ساتھ اس جگہ کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کیلئے صلاح ومشورہ کرتے ہیں وہ افسران کے ساتھ مقامی مسائل انکے حل اور مشکلات

کی اَزالگی پر گفتگو کرتے ہیں۔ ترّقی کے منصوبوں اور سماجی بہبود کی سرگرمیوں کی وسعت کے بارے میں غور وخوض کر کے مناسب فیصلے صادر کئے جاتے ہیں تب بخشی صاحب لوگوں کے اجتماعات سے خطاب کر کے انہیں حکومت کی پالیسی اور ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں۔ وہ انہیں بتاتے ہیں کہ لوگوں سے ریاستی معاملات اوراِس کی معاشی، زراعتی، صنعتی اور سماجی ترقی کے میدان میں کون سارول اَدا کرنے کی توقع ہے وہ ان کے مسائل کا حوالہ دیکر ان پر واضح کرتے ہیں کہ انتظامیہ کس طرح اُن مسائل کو حل کرنے کا خواہاں ہے۔ ان مواقع پر ہمیشہ انَ سے سوالات کئے جاتے ہیں اور مختلف اُمور کی وضاحت کروائی جاتی ہے۔ بخشی صاحب مستقل مزاجی سے ان کے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔ لوگوں کے اجتماعات میں بخشی صاحب نے ایک ایسا اَندازہ قائم کیا ہے جو نرالا ہے۔ وہ لوگوں کو اس بات کی پوری سہولیت دیتے ہیں کہ وہ انہیں پوری طرح پہچان لیں۔ وہ نہ تو لوگوں کی سطح سے پَست ہو کر ان سے خطاب کرتے ہیں اور نہ ہی بلند ہو کر۔ بلکہ وہ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔ اِس بات کو تاڑ کر کہ ان کے من میں کون سی باتیں ہیں بخشی صاحب ان باتوں پر بے کم وکاست باتیں کرتے تھے۔

وہ ان میں شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان سے منفی انداز میں سوالات پوچھتے ہیں اوران کی غلطیاں تاک لیتے تھے۔

بخشی صاحب صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ پایہ کے جمہوری رہنما تھے۔ لوگوں کا ایک ایسا رہنما جس کا دل لوگوں کے دل کی دھڑکوں کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔

(ماخوذ)

کمال احمد صدیقی

اَدب نواز

تیری محفل میں کیوں ہے سوں چُپ
اِسکی فطرت زبان درازی ہے
چشمِ نرگس جُھکی ہے تیرے حضور
آج کیسی نگاہ بازی ہے
غمِ دَوراں سے دل ہے بے پرواہ
بے نیازی سی بے نیازی ہے
کسی شاعر کو اَب نہیں شِکوہ
بے حقیقت سخن طرازی ہے
جاگ اُٹھا وقارِ اہلِ اَدب
تیری شان اَدب نوازی ہے

شمیم کرہانی

تیری محبّت، تیری جوانی

(خالدِ کشمیر کی خدمت میں)

سیلِ بلا میں ، ناؤ بڑھائے ، تیری محبّت تیری جوانی
تند ہوا میں شمع جلائے ، تیری محبّت تیری جوانی

جہلم کی دلکش وادی میں ،کیسر کی سُندر دھرتی پر
ایک نیا سنسار بسائے ، تیری محبت ، تیری جوانی

رنگ محل میں خاک اُڑا کے ، شیش محل کی شمع بجُھا کے
کٹیاوں میں دیپ جلائے ، تیری محبّت، تیری جوانی

اہلِ سفر کے سُکھ کی خاطر ، وادی وادی، پربت پربت
راہ نکالے ، راہ بنائے ، تیری محبّت، تیری جوانی

چشموں کی برہم لہروں پر، ندیوں کے سرکش دھاروں پر
قید لگائے ، بند بنائے ، تیری محبّت، تیری جوانی

اہلِ جہاں کی رِیت نہ پوچھو، اپنا نشیمن ، اپنا بسیرا
گاؤں سنوارے ، شہر سجائے ، تیری محبّت ، تیری جوانی

حال کی راتوں سے لڑتی ہے، یاس کی باتوں سے لڑتی ہے
مستقبل کی آس لگائے ، تیری محبت ، تیری جوانی

اُٹھ کے زمیں سے گِرنے لگے جو، گر کے زمیں پر اُٹھ نہ سکے جو
اُس کو سنبھالے، اُس کو اُٹھائے، تیری محبت، تیری جوانی

حبِ وطن کی مستی ایسی خاک وطن کے ہر ذرّے کو
آنکھ سے چومے، دِل سے لگائے، تیری محبت، تیری جوانی

غم کی گھڑیاں ہنس کر جھیلے، عشق وطن میں جان سے کھیلے
ظلم کے آگے سر نہ جُھکائے، تیری محبت، تیری جوانی

بستی بستی سورج چمکیں، نگری نگری چاند ستارے
دھرتی کو آکاش بنائے، تیری محبت، تیری جوانی

رن میں بڑھے، پرچم کو سنبھالے، آنکھ اجل کی آنکھ میں ڈالے
جینے کے انداز سِکھائے، تیری محبت، تیری جوانی

مُلا ہمدم، پنڈت ساتھی، عشق وطن کی راہ گزر میں
دیر و حرم کو ساتھ چلائے، تیری محبت، تیری جوانی

پرچم کھولے، تیشہ تولے، ہاتھ کروڑوں ساتھ کو حاضر
جِس میداں میں پاؤں بڑھائے، تیری محبت تیری جوانی

رات اندھیری، راہ میں کانٹے، پھر بھی رواں ہے پھر بھی رواں ہے
دور اُفق سے آنکھ لڑائے، تیری محبت، تیری جوانی

پستی سے ہستی کو ابھارے، پربت سے وادی کو پکارے
قوسِ قزح کی سمت بلائے، تیری محبت، تیری جوانی

●●●

لطیف رسول

گوہرِ آبدار

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا پر ملی خاک میں سحر بیانی اسکی
اب گئے اسکے جز افسوس نہیں کچھ حاصل حیف صد حیف، کچھ قدر نہ جانی اسکی

مرحوم و مغفور خالد کشمیر بخشی غلام محمد جموں و کشمیر کے سیاسی اُفق پر ایک درخشاں ستارے کی مانند چالیس سال تک جلوہ افروز رہے جو اپنی پاکیزہ عادات وخصائل کے طفیل عوام میں اِس قدر مقبول ہوئے کہ کبھی ''بڈ شاہِ ثانی'' تو کبھی ''حاتمِ ثانی'' کے گراں قدر القاب سے ملقب ہوئے۔

بخشی صاحب کو لاشریک اللہ جل جلال اللہ نے صفت ہمہ دانی سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ وہ ایک چابک تر سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ایک چاق چوبند منتظم، ایک فریادرس قانون داں، ایک سریع الاثر مقرّر، ایک بہادر پاسبانِ وطن، ایک نکتہ سنج ادب نواز، ایک نگاہ بلند مردِ قلندر اور ایک عظیم معمارِ قوم بھی تھے۔ اِنہی بلند پایہ خوبیوں کے پیش نہاد شیر کشمیر مرحوم و مغفور شیخ محمد عبداللہ نے انہیں جمہور نواز تحریک کا ''روحِ رواں'' قرار دیا تھا۔ بخشی صاحب صبر و تحمل، حلم و بردباری سے بہرہ ور ایک مستقل مزاج شخصیت کے مالک تھے جو موقعہ پرست، سیاہ باطن سیاست دانوں سے قطعی الگ تھلگ اپنا ایک منفرد اندازِ فکر رکھتے تھے۔ اُنہوں نے وزارتِ عظمیٰ
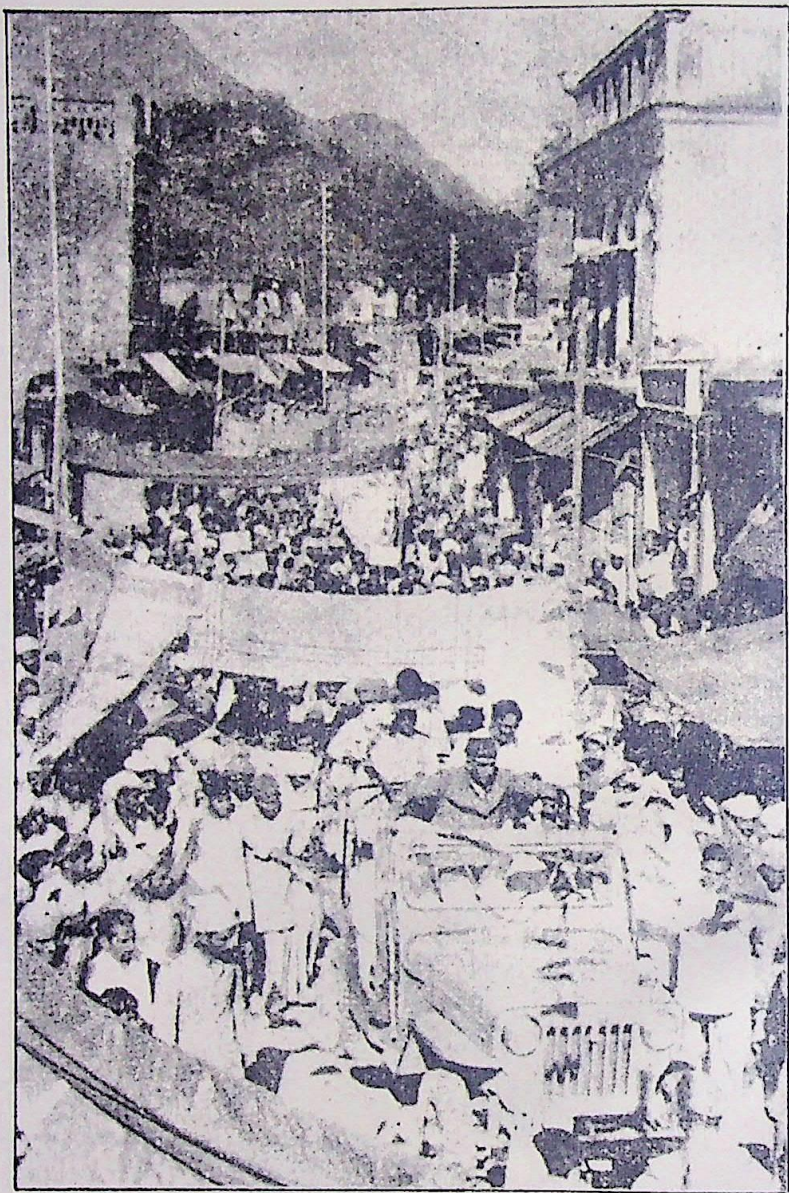
والہانہ اِستقبال

سادہ لوح دیہاتیوں کے ساتھ
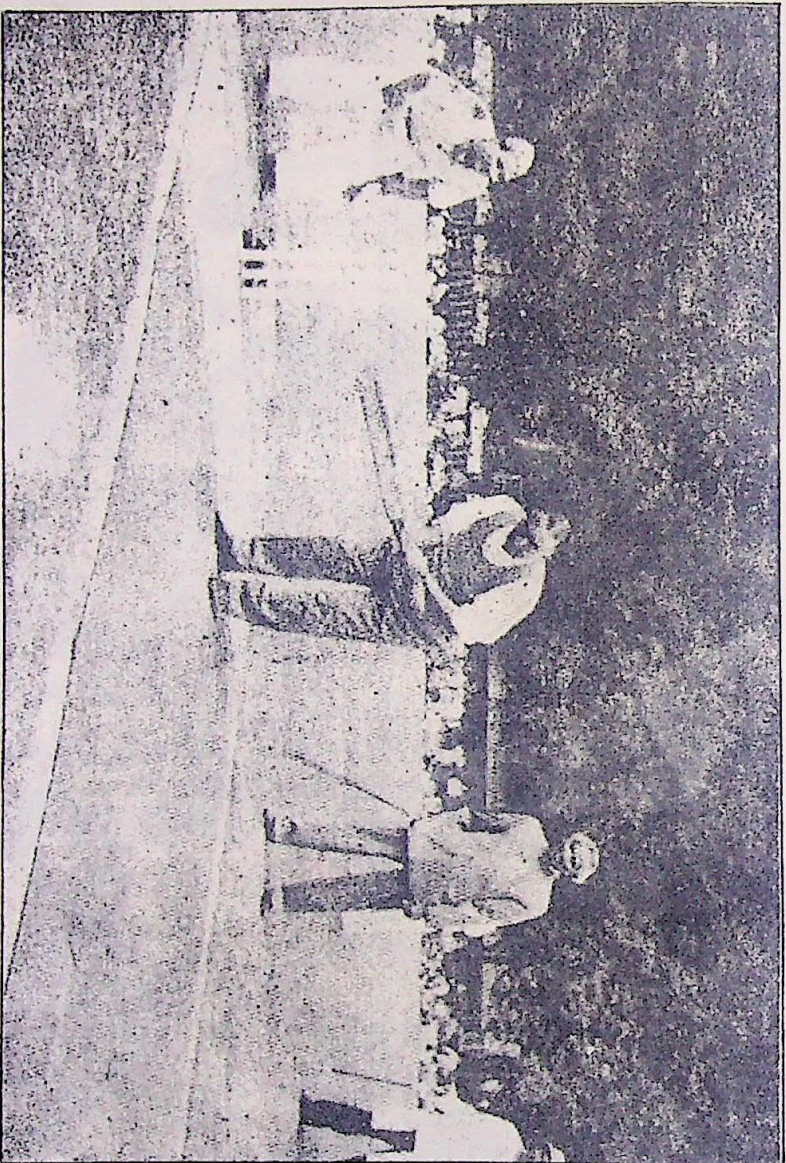
بخشی صاحب...... بلے بازی کا انداز

ترقی کا ایک نیا سنگ میل......

کے عہدۂ جلیلہ کا قلمدان سنبھالنے سے معزولی کے سالہائے مابعد تک ریاست کے سیاسی مستقبل کے حوالے ذاتی موقف میں کوئی تبدیلی نہ لائی جو بخشی صاحب کے پاکیزہ دل ودماغ کا غماز ہے۔ اُنہیں سیاسی استحصال علم کی عیاری اور مکروفریب پر منحصر سیاست سے زبردست کراہت تھی۔ وہ بے شک اِس متروک اور مقہور قوم کے پُرخلوص اور ایک خوش نہاد رہنما تھے۔

بخشی صاحب مرحوم کے عوامی رابطہ کا یہ حال تھا کہ لوگ بغیر کسی ہچکچاہٹ اور رکاوٹ کے اَپنے غمخوار قائد سے مِلا کرتے تھے۔ مابنزاع شخصیّت ہونے کے باوجود وہ حفاظتی پہرہ داروں کے بغیر ہی عوام سے ملاقی ہوا کرتے تھے۔ بسا اُوقات عورتیں اَپنا حالِ پُرملال سنوانے کی خاطر بخشی مرحوم کے کپڑے تک کھینچ لیتی تھیں۔ عومی جلسہ جلوس کے دَوران لوگ بے باکانہ انداز میں سٹیج تک بھی رسائی حاصل کرتے تھے اور تقریر میں بے جا مخل ہوا کرتے تھے۔

بخشی مرحوم ہفتہ میں تین دن اَپنے انتخابی حلقہ میں حاضری دیکر عوامی مسائل کا برمحل اور تسلی بخش حل نکالا کرتے تھے۔ غریب عوام کو سرکاری عدالتوں میں کرب انگیز مقدمہ بازی سے بچانے کی خاطر اِس شفیق القلب قائد نے ہی لوک عدالت کا انقلابی تصوّر دے دیا جہاں کاروائی مرحوم بخشی یا والدہ مرحومہ کی صدارت میں ہوا کرتی تھی۔

سرکاری انتظامیہ کی صورت بھی نہایت ہی خوش کن تھی۔ عوامی مشکلات وشکایات کے فوری ازالہ کیلئے اِس بندہ نواز اور غریب پرَور رہنما نے 'کھُلے دربار' کا تصوّر بھی دے دیا جہاں مستغیث حضرات مع سرکاری حکام کے بالمواجہہ بخشی مرحوم چشم زدن فیصلے دیا کرتے تھے۔ سرکاری معاملات میں مرحوم بخشی مردم آزاری قطعی برداشت نہ کرتے تھے۔ ''دفتری طوالت'' اور لال فیتہ شاہی جیسی پُرپیچ رکاوٹوں

سے متنفر آپ فوری فیصلہ جات صادر کرنے کے قائل تھے۔

ایک باصلاحیت اور کہنہ مشق عمیدِ سیاست ہونے کے ساتھ ساتھ آپ غیر معمولی اَدبی شعور کے بھی مالک تھے۔ شاعرانہ اور ادیبانہ محافل میں شرکت کرنا اور شعراء حضرات کے تخیّل کا بہ گہرائی جائزہ لے کر بقدرِ ضرورت دادِ تحسین دینا آپ کے اَدبی مزاج کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ حضرت شیخ المشائخ شیخ نور الدین نورانیؒ اور لل عارفہ کا عاشق صادق حبہ خاتون اور أرنہ مال کا متوالا، مہجورؔ اور رسول میر کا شیدائی بھی بخشی مرحوم تھا جس نے اُس بخشی کو نہیں دیکھا، اس نے ایک بڑے اَدب نواز کو نہیں پہچانا، رقص وموسیقی کے ساتھ بھی بخشی صاحب کو والہانہ کشش تھی۔ ستار، سنطور، ہارمونیم اور گھنگھروؤں کی وجد آور موسیقی سے آپ پر ایسی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی کہ بسا اوقات آپ صف شکنی سے کام لے کر گلوکاروں اور موسیقاروں کی جمعیت میں داخل ہوکر پابہ کوباں ہوا کرتے تھے اور معزز حاضرین وناظرین میں سے چنندہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔

حق وصداقت تو یہی ہے کہ مظلوم اور متروک کشمیریوں کو بخشی صاحب نے اَپنے حُسنِ تدبّر سے اور متواتر تگ ودو کے طفیل کاروانِ ہستی میں ایک معزّز مقام بخشا۔

"نیا کشمیر" کا رُوح پرور خواب شرمندہ تعبیر کرنے میں بخشی صاحب کا ایک قابلِ ستائش کردار رہا۔ ریاست جموں وکشمیر کے جداگانہ سیاسی تشخّص کی برقراری کیلئے ایک وسیع وعریض دستور کو تشکیل دلوا کر اسکا عملی نفاذ بھی بخشی مرحوم کے ہی دورِ اقتدار کے دَوران ۲۶ر جنوری ۱۹۵۷ء کو ہوا۔

"نیا کشمیر" کے انقلابی منصوبہ کے تحت جواہر ٹنل کی تعمیر، سڑکوں کا وسیع ترجال، سرینگر اور جموں میں (دفاتر معتمد) نیو سیکرٹریٹ بلاکس کا قیام، عام تعلیم کا پھیلاؤ،

جموں وکشمیر یونیورسٹی، انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج، ادارہ برائے نقشہ جات اور پالی ٹیکنک کا قیام، تمدن وعلوم کا احیاء اور کلچرل اکادمی کا قیام، فی کس آمدنی میں اضافے کی خاطر گھریلو دستکاروں وچھوٹی صنعتوں کی ترویج، سیاحت کو فروغ بخشنے کیلئے سرینگر اور جموں میں سیاحوں کے استقبالیہ مراکز کا قیام، زرعی پیداوار میں اضافے کیلئے نہروں کا جال، لفٹ اِری گیشن کے کئی مراکز کا قیام، نئے بیجوں، کیمیائی کھاد اور جدید زرعی آلہ جات کا تعارف، صحتِ عامہ کی بہتر سہولیات اور شفاء خانوں کا وسیع جال، کھیلوں کا فروغ، سرینگر اور جموں میں سٹیڈیم کی تعمیر، بکروالوں اور خانہ بدوش لوگوں کی تعلیم اور صحت کی خاطر متحرک سکولوں اور شفاء خانوں کا قیام، ان صریح حقائق کو ملحوظ نظر رکھ کر ہر خاص وعام کی زبان پر بے ساختہ یہی الفاظ آئیں گے:

ان سب میں تیری ذات گرامی ہی رہے گی، کشمیر کی تواریخ میں جتنے ہیں مشاہیر اے خالد کشمیر
اظہار حقیقت ہے نہیں مدح سرائی، صادق کا قلم کیوں نہ صداقت کرے تحری، اے خالد کشمیر اے خالد کشمیر
معمار وطن حب وطن دل میں تیرے ہے، ہے ذکر بھی تعمیر تیرا فکر بھی تعمیر، اے خالد کشمیر اے خالد کشمیر

بیروں ریاست بھی بخشی مرحوم کی پُرجلال شخصیّت نے عوامی دلوں کو وسیع پیمانے پر جیت لیا تھا۔ بخشی صاحب اپنی چابک تری، اعلیٰ حسنِ تدبّر اور کمال ذہانت کو بروئے کار لاکر ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو رفع کرنے میں بھی سرگرم عمل رہا کرتے تھے۔ نتیجتاً امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ارتحال پذیر ہونے کے بعد جو خلاء ہندوستان میں پیدا ہو چکا تھا اسے پُر کرنے کیلئے ہندی مسلمانوں کی نظریں صرف اس مردِ آہن پر لگی ہوئی تھی جو اپنے مادرِ وطن کی ہمہ گیر ترقی اور تعمیر نو میں مستغرق اور محو رہنے کی باعث ہندی مسلمانوں کی اس دیرینہ خواہش کے مطابق مولانا کے رفیع القدر مسندِ امامت وسیاست کو سنبھالنے میں اترا تے رہے۔

●●●

سید محی الدین قادری زور

بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

ہندوستان کی آزادی اور تقسیم کے نتیجہ کے طور پر اِس ملک میں جو مسلمان رہنما باقی رہ گئے تھے اُن میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد بخشی غلام محمد صاحب کی ذات ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اِس لئے کہ وہ راہ و رسمِ منزل کی نزاکتوں کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پنگھٹ کی ڈگر بہت کٹھن ہے اور اس میں وہی سُرخرو اور شادکام رہ سکتا ہے جو حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ جیسی وسیع القلبی اور فراخ نظری سے بہرہ ور ہو۔

بخشی غلام محمد صاحب کو قدرت نے قلب و دماغ کی جو خوبیاں عطا کی ہیں ان کی تفصیلات فرصت اور موقع چاہتی ہیں۔ اُن کی انتظامی قابلیت کے کرشمے کسی کو دیکھنے ہو تو وہ کشمیر جنت نظیر میں چندروز گذار آئے۔ حُسنِ اِتفاق سے مجھے دو سال قبل اِس کا موقع ہے اور چونکہ وہاں میں خود اپنی موٹر میں گیا تھا اِس لئے قریہ قریہ اور جگہ جگہ ٹھہرنے اور کشمیری عوام سے ملنے اور اُن سے بے تکلف بات چیت کرنے کے متعدد مواقع ہاتھ آئے تھے۔ ہر جگہ کے بچے اور بوڑھے اَپنے وزیرِ اعظم کی انتظامی قابلیت اور عوام کے دُکھ درد کے احساس کے دل سے قائل نظر آئے۔

میں نے محسوس کیا کہ ہر شخص ان کی ہمہ جہتی مصروفیت اور جذبہ ہمدردی کے

بارے میں رطب اللسان ہے۔ بلا لحاظِ مذہب و ملک سبھوں نے یہی کہا کہ ''اگر اس وقت وہ نہ ہوتے تو آج ہم بھوکوں مرجاتے۔ ہمارے ملک کیلئے اُن کی ذات خدائے تعالیٰ کا ایک بہترین اور بے نظیر عطیہ ہے اور ہم شکر گزار ہیں کہ اِس زمانے میں بخشی صاحب ہمارے سفینے کے ناخدا ہیں''۔

میں نے خود دیکھا کہ ہر تقریب میں بخشی صاحب کی بلند و بالا شخصیت عوام و خواص دونوں کے ساتھ میل ملاپ میں ایسا مخلصانہ برتاؤ کرتی تھی کہ ملنے والوں کے دل ان کی محبت اور عقیدت سے معمور ہو جاتے تھے۔

کارفرمائی اور مقبولیت عامہ کے اِن جوہروں کے علاوہ بخشی صاحب کو اَدب اور موسیقی اور شاعری سے جو گہری دلچسپی ہے اِس سے ذاتی طور واقف ہونے کا مجھے ابھی چند ماہ قبل موقع ملا ہے جبکہ وہ ایوانِ اُردو کا افتتاح کرنے حیدرآباد تشریف لائے تھے۔

ہندوستان کی تہذیبی روایات اور ہمارے مشترکہ کلچرل ورثہ کی خصوصیات پر بھی اُن کی بڑی گہری نظر ہے۔ اُردو زبان اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے جتنا انہماک ان میں نظر آیا ہندوستان کے دوسرے مسلمان قائدین میں کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایوانِ اردو کی افتتاحی تقریب کے موقع پر میں نے جو تقریر کی تھی اِس میں کہا تھا کہ بخشی صاحب مولانا آزاد مرحوم کے بعد اُردو والوں کے سب سے بڑے لیڈر اور رہنما ہیں۔ اِسی لئے ان کی نظریں ہر ضرورت کے وقت انہی کی طرف اُٹھتی ہیں۔

ان سب خصوصیات اور خوبیوں کے علاوہ جو بات ان کو اپنے ہمعصروں میں ممتاز کرتی ہے میری نظر میں وہ ان کی خدا ترسی اور تصوّف وعرفان سے ان کا بے پایاں انہماک ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مخلوقِ خدا کی خدمت میں رات دن

مصروف رہتے ہیں اور بلا امتیازِ مذہب وملّت اَچھے اور بُرے دوست اور دشمن گورے اور کالے ہر ایک کے ساتھ نیکی بھلائی کا برتاؤ کرتے ہیں۔

یہ آسان کام نہیں ہے خاص کر ایک سیاسی رہنما کیلیئے اور اس سے بڑھ کر کشمیر جیسی ریاست کے وزیراعظم کیلیئے۔ لیکن بخشی صاحب کے ذاتی خیالات اور طبعی رجحانات کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کے راستے کی کٹھنائیاں روز بروز آسان ہوتی جائیں۔

جبینِ مُستقبل

''اقتصادی سدھار کی سرگرم کوششوں کے نتیجہ میں یہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی عام طور سے بلند ہوا ہے۔ پسماندگی، غربت اور بھوک کی بدعتیں جو صدیوں سے یہاں کے لوگوں کو اَپنے گرفت میں لئے ہوئے تھیں، رفتہ فتہ ہمارے درمیان سے نیست ونابود ہوتی جارہی ہیں اور خوش حال اور مسرّت کی منزلیں قریب آنے سے ان کی زندگیوں میں کچھ رنگینی پیدا ہوئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی طرز زندگی پر بھی اس کا کچھ سماجی اثر پڑا ہے اور تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔ چنانچہ آپ کے ذہن میں اس ثقافتی اُبھار کی یاد بالکل تازہ ہوگی جو پہلے سال ''جشن کشمیر'' کے دوران ریاست کے تمام حصوں میں دکھائی دیا''۔

بخشی غلام محمد۔ ۲۶/جولائی ۱۹۵۹ء

رسا جاودانی

معمارِ وطن

جوبن پہ ترے دَم سے ہے یہ گلشنِ کشمیر
بھن کی ہواؤں میں بھی ساون کی ہے تاثیر

اے خالدِ کشمیر

یوں صرصرِ راحت سے شگفتہ ہوئے خاطر
جیسے کہ بہاروں میں کھلے غنچۂ دل گیر

اے خالدِ کشمیر

تن من سے تو تعمیر میں سرگرم شبا روز
اور جوشِ عمل میں نہ تکلم نہ تقاریر

اے خالدِ کشمیر

اِن سب میں تری ذات گرامی ہی رہے گی
کشمیر کی تاریخ میں جتنے ہیں مشاہیر

اے خالدِ کشمیر

اظہارِ حقیقت ہے ، نہیں مدح سرائی
شاعر کا قلم کیوں نہ صداقت کرے تحریر

اے خالدِ کشمیر

معمارِ وطن حب وطن دل میں ترے ہے
ہے ذکر بھی تعمیر ترا فکر بھی تعمیر

اے خالدِ کشمیر

تا یاز کن

محبوب قائد

وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد کے عوام سے تعلقات ہند بھر میں لامثال تھے اور عام لوگ ان کے ساتھ اِس حد تک قریب تھے کہ بعض اوقات یہ بے تکلّفی اور یہ قربت پریشان کن حتیٰ کہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ وزیر اعظم لوگوں سے اس طرح گھل مل کر باتیں کرتے تھے کہ ایسے موقعوں پر نہ تو مراسم کا ہی لحاظ رکھا جاتا ہے اور نہ کوئی دُوری محسوس کی جاتی تھی۔

ایسے موقعوں پر نہ تو پولیس کے آدمی ہوتے اور نہ کوئی کٹھرا ہوتا تھا۔ ایسے ہی کوئی اور آدمی سٹیج کے بالکل قریب آ سکتا تھا اور اس پر چڑھ بھی سکتا تھا۔ ایسا تو بہت سارے آدمی کرتے ہیں اور جب بوجھ سے لکڑی کے تختوں کے ٹوٹ جانے کا خطرہ محسوس ہونے لگتا تو اِس پر سے لوگوں کا بوجھ کم کرنے کیلئے 'کشمیریوں کے محبوب' بخشی غلام محمد دفعتاً اپنی تقریر ختم کرتے اور لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ نکالتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ لیکن لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ ساتھ اس طرح چمٹے رہتے تھے جیسے چھتے پر شہد کی مکھیاں۔

لوگوں کے ساتھ بخشی غلام محمد کے تعلقات کے بارے میں ایک نمایاں بات یہ تھی کہ وہ ان کے ساتھ گھل مل جانے پر مصر ہوتے تھے اور کوئی حفاظتی دستہ اپنے

ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ وہ گاؤں کے ہر آدمی سے ملتے تھے۔ لوگ چاہیں تو ان کی پیٹھ پر تھپکیاں بھی دیتے یا بسا اوقات عورتیں اپنی درخواستیں پیش کرنے کیلئے ان کے کپڑوں کو بھی کھینچ لیتی تھیں۔ یہی طریقہ تھا بخشی صاحب کا لوگوں سے ملنے کا۔ وہ لوگوں کے ساتھ ایک وزیر اعظم کی طرح بات نہیں کرتے بلکہ ان کا طریقہ کچھ ایسا تھا جیسا کہ کسی محفل ساز و سرور کے منتظم کا۔ جو ایک طرف اشارہ کرے تو فوراً ساز بجنے لگتا تھا اور دوسری جانب اشارہ کرے تو تاروں پر مضراب لگنا شروع ہوتا تھا۔ بخشی صاحب کا یہ طریقہ سادہ بھی تھا۔ وہ لوگوں پر تقریریں نہیں جھاڑتے بلکہ اُن سے کھلے بندوں بات چیت کرنے کیلئے ان کے ساتھ گھل مل جاتے تھے۔ وزیر اعظم لوگوں کے ساتھ یہ بات چیت مکالمے کے انداز میں کرتے ہوئے اُن کو درمیان میں بولنے کا موقعہ بھی دیتے تھے اور اِس بات چیت کے دوران عورتیں بھی جوابات دیتی تھیں۔ کسانوں سے بات چیت کرنے کا یہ بڑا اسیانا طریقہ تھا۔ اِس میں فائدہ تھا کہ لوگ اس میں دلچسپی بھی لیتے تھے اور وزیر اعظم اور اَپنے درمیان کوئی سا بھی فرق محسوس نہیں کرتے۔ بخشی صاحب کی تقریریں بڑی آسان بھی ہوتی تھی۔ وہ مطلب کی بات کرتے تھے اور اِس میں عام لوگوں کی پسند کا میٹھا میٹھا مزاج بھی ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر لوگوں کے چہروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اگر کہیں کسی بچّے کے چیخنے کی آواز بھی آجائے یا کوئی پرایا آدمی وہاں سے چلے تو بھی ان کی توجہ نہیں ہٹتی اور یہ واقعی ایک بڑا کارنامہ تھا۔ عمومی انداز میں باتیں کہنے یا سامعین کے سامنے کسی چیز کا تصوّر پیش کرنے میں ایک مشاق مقرّر کو بڑی آسانی ہوتی تھی لیکن جب یہی بات عام لوگوں کی روز مرّہ ضروریات کے خشک مضمون کے متعلق کہنی ہو تو یہ آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایک افضل مقرّر تھے اور اَپنے ڈھنگ میں ہند بھر میں لاثانی تھے۔

وزیراعظم کے ہمراہ سفر کرنے کیلئے جسمانی طاقت کے علاوہ گھوڑے کی سواری، تیراکی اور کوہ پیمائی کے فنوں سے واقف رہنے اور لوگوں کے اُن بے پناہ ہجوموں سے راستہ نکال کر آگے بڑھنے کی ترکیب جاننے کی ضرورت تھی جو اُن کا بڑے جوش وخروش سے خیر مقدم کرتے تھے۔ لوگوں کا یہ جوش وخروش اور یہ وقت اس وقت بڑا کام دیتے تھے جب ان کو وزیراعظم کے راستے میں جیپ کو کسی کیچڑ کے گھڑے سے اوپر اٹھانا ہوتا تھا۔ یا اسے کسی ایسے موڑ سے گزارنا پڑتا تھا جو وہاں اس غرض کیلئے انہی لوگوں کے (جو کہ جیپ کے کَل پُرزوں سے واقف نہیں ہوتے) فوری طور پر بنایا ہوا ہوتا تھا۔ کہیں اگر سڑک بالکل ڈھلوان ہوتی تھی تو یہ لوگ ایک ساتھ مل کر جیپ کو دریا میں گرنے سے روکنے کیلئے تیار ہوتے تھے اور جیپ کو دریا سے بنڈ پر لے جانے کا کام بڑی خوشی سے کرتے ہیں۔ جہاں جیپ نہیں جاتی وہاں وزیراعظم یا تو گھوڑے پر جاتے تھے یا پیدل۔ لوگ ان کے پانچ میل اور پا پیادہ چلنے کا کوئی خیال نہیں کرتے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ وزیراعظم وہ سب کچھ بھی دیکھ لیں جو ان کے پُروگرام میں درج نہیں۔ بخشی صاحب کو (اس بات کے باوجود کہ ان کی ایک ٹانگ عرصہ پہلے ٹوٹ گئی تھی) آخر کار آگے جانا ہی پڑتا تھا۔ کیونکہ عوام ان کی زبان سے 'نہ' کا لفظ نہیں سننا چاہتے۔ جب انسان اس بات پر دھیان دیتا تھا کہ وزیراعظم کشمیر اپنے حلقے میں ہفتے میں تین دن (۱۷ گھنٹہ روزانہ) سفر کرتے تھے تو وہ ایک چھوٹے بچے (جو صرف بعد دوپہر کچھ وقت کیلئے وزیراعظم کے ساتھ تھا) کی اس بات سے متفق ہو جاتا تھا کہ:

'وزیراعظم ہونا بڑا مشکل ہے۔'

محمد ایوب بیتاب

ساقی

بڑی خود اعتمادی سے تیرے میخوار بیٹھے ہیں
کوئی جمشید ہے ساقی، کوئی پرویز ہے ساقی

مجھے بھی جلد جام بادہ گلفام دے، جاؤں
کہ رفتارِ ترقی اب بہت ہی تیز ہے ساقی

بتا کس نے میرے کشمیر کا نقشہ بدل ڈالا
جہاں بنجر تھے وہ مٹی بھی اب زرخیز ہے ساقی

دہائی خالدِ کشمیر کی دیتے ہیں تشنہ لب
یہ کس کا نام ہے جو اتنا دلاویز ہے ساقی

●●●

اُمیش کول

خاکہ اور رنگ

بخشی صاحب کی شخصیت جس بے پناہ قوتِ عمل کی حامل تھی اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کیلئے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں فن وادب اور فکر و تخیل کا زیادہ گزر نہ ہوگا۔ اس شخصیت کا مالک کبھی کوئی رنگین سا گیت سن کر ٹھٹک نہیں سکتا۔ کسی شوخ سی تصویر کو دیکھ کر رُک نہیں سکتا۔ کسی ساز کی مضطرب سی آواز سن کر تڑپ نہیں سکتا۔

اور پھر ڈر سا لگتا ہے کہ کہیں ان کے ہاتھوں سے شیشہ تمدن گر کر چُور نہ ہو جائے، اُن کی قیادت میں پروان چڑھتا ہوا یہ نظام محض ایک مشینی نظام ہو کر نہ رہ جائے۔ جہاں صرف کھیت پکیں اور خواب مضمحل ہوں۔ صرف راہیں تعمیر ہوں اور رُوحیں تشنہ رہیں۔ محض دولت پیدا ہو اور دلوں پر مُردنی چھائے۔ تو اریخ میں کچھ ایسے بھی ناظم اور ہادی ہوئے ہیں جو اپنی قوموں کو کھیت اور اناج، راستے اور رسل و رسائل، دولت اور کام کاج تو دے سکے، لیکن ایک مسکراہٹ نہ دے سکے۔ جن میں عزم و استعداد تو تھا لیکن وہ دِل نہ تھا جو دھڑکتا ہے۔ وہ رگ نہ تھی جو دُکھتی ہے اور جب آدمی کے پاس صرف عزم و استعداد رہتا ہے۔ ایک دھڑکتا دل نہیں رہتا۔ ایک دکھتی رگ نہیں رہتی تو وہ حُسن سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس کیلئے تمدن اور تمدن کی زبان بے معنی ہو جاتے ہیں۔

لیکن جب تصوّر کی یہ مہیب موج گزر جاتی ہے، خیالات تہہ لینے لگتے ہیں تو ذہن میں بخشی صاحب کی ایک دُوسری تصویر اُبھرتی ہے۔ ایک دل فریب سی تصویر، جس میں بخشی صاحب کی بے پناہ قوتِ عمل کے ساتھ اُن کی حساس طبیعت بھی جھلکتی ہے۔ جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے، آنکھوں میں جستجو اور فراخ ماتھے پر فکر و تخیّل کے سائے۔ یہ تصویر ایک ایسے آدمی کی تصویر ہے جو پہروں آسمان کی نیلی وسعتوں کے معنی ڈھونڈتا رہتا ہے۔ جو بیٹھے بیٹھے ایک خیال کی تلاش میں بہت دُور نکل جاتا ہے اور جب حسن کو پاتا ہے تو بے اختیار داد دیتا ہے۔

دراصل بخشی صاحب کی شخصیّت کا توازن، ان کے عزم و استعداد کے ساتھ، ان کا فکر و تخیّل اور سب سے بڑھ کر اُن کی حساسی سے قائم رہتا ہے۔ جس نے انہیں محض سیاسی رہنما کے روپ میں دیکھا ہے۔ فن کے شیدائی، فن کار کے ہمدم کے روپ میں نہیں دیکھا ہے وہ ان کی شخصیّت کا صحیح تجزیہ نہیں کر سکتا۔ اس نے تصویر کا صرف خاکہ دیکھا ہے، رنگ نہیں دیکھے ہیں۔ پرائم منسٹر بخشی سے کہیں، دلچسپ حبہ خاتون اور ارنہ مال کا متوالا بخشی ہے۔ وہ بخشی، جس نے للہ عارفہ اور شیخ نور الدین نورانی کے تقدس کو سینے میں جگہ دی ہے۔ جس کے اَنگ اَنگ میں مہجور کے نغموں کی مہک رَچی ہوئی ہے۔ جس نے اِس بخشی کو نہیں دیکھا اس نے ایک بہت بڑے اور حقیقی ادب شناس کو نہیں دیکھا۔

یوں فن کی قدر دانی کرنے کا خبط عموماً 'خواص' پر اِس قدر سوار رہتا ہے کہ ایک ماہر سیاست، جس نے کبھی فنِ تعمیر سے متعلق کبھی کچھ سنا نہ پڑھا، بڑے اطمینان کے ساتھ فن تعمیر کے کسی بھدے سے نمونے کے حق میں ایک تعریفی تقریر کر بیٹھتا ہے۔ ایک ماہر معالج کو ادب کے رموز سے واقف نہیں، بڑی آسانی سے

ایک اَدَبی شاہکار کو گھٹیا قرار دیتا ہے اور ایک ماہر میک اَپ بالوں کی پانی ٹیل بنائے، ہونٹوں پر لپ اِسٹک اور چہرے پر غازہ پھرتے، ایک تصویر کو دیکھ کر بغیر سمجھے بڑی نزاکت سے کہتی ہے 'ہائے کیا خوب ہے!'

لیکن فن کے ہمارے قدردان...... بخشی صاحب شاید اس لئے بھی کہ وہ خواص کی صف میں سے نہیں۔ اِس مندر میں پُجاری کی طرح آتے ہیں، صاف دِلی اور بے تعصبی کے ساتھ۔ فن اَز خود اِن پر اپنا حُسن آشکار کرتا ہے۔ اور یہ اِسی حُسن کی کرِنوں کو اَپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ کسی داخلی ترغیب کے بغیر، وجد کی حد تک مسَرور ہو جاتے ہیں۔

اگر خوبصورت سے مسرور ہونے کی صلاحیت ذوق کی صحیح تعریف ہے تو بخشی صاحب ایک حقیقی باذوق آدمی ہیں۔

بخشی صاحب کو فن کا سودائی کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ جہاں کہیں محفل مشاعرہ منعقد ہوتی اور آپ کے پاس تھوڑا سا بھی وقت ہوتا تھا۔ آپ محفل میں چلے آتے تھے۔ پرائم منسٹر کی حیثیت میں نہیں، ایک عاشق کی طرح اور آلتی پالتی مار کے بیٹھ کر انہماک سے شعراء کا کلام سنتے تھے۔ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ، آنکھوں میں وہی جستجو اور ماتھے پر فکر و تخیّل کے وہی سائے۔ آپ ہمیشہ اُس فاصلے کو مٹا دیتے ہیں جو ایک فن کار اور قاری کے درمیان ہوتا ہے۔

کبھی ایک جواں سال شاعر نے اپنی غزل میں کہا تھا۔

میں ایک لمحہ جینے کیلئے ایک گھونٹ زہر پی لیتا ہوں

نظام حیات آج بھی اس سے بہتر نہ ہوسکا

شعر حسین تھا۔ آپ نے بے اختیار داد دی۔ شاعر کو زندگی سے شکایت تھی۔

آپ سنجیدہ ہو گئے اور کچھ سوچتے رہے۔ ایسے لگتا تھا جیسے آپ شاعر کے دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر اس تلخی کا منبع کھوج نکالنا چاہتے ہوں اور جواں سال شاعر سے کہنا چاہتے ہوں۔ ''تم اس عمر میں یہ کون سا روگ لگا بیٹھے ہو، تمہاری یہ عمر ہنسنے چہکارنے کی ہے۔ ہنسو اور شادمانی کے گیت گاؤ!''

پھر جب محفل برخاست ہوئی، آپ شاعر سے، اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے مخاطب ہوئے...... ''زندگی سے یوں مایوس نہیں ہوتے عزیز۔ امید ہے اگلی محفل میں کوئی ہمت افزا کلام سناؤ گے!''

اس نظام سے شکوہ کرنے والا شاعر شاید آپ کے مدّاحوں میں سے نہیں تھا لیکن آپ اِس کے سب سے بڑے مدّاح تھے!

ورائٹی شوز میں، جو مشاعروں کی نسبت آداب سے آزاد رہتے ہیں۔ آپ بے تکلف ہو کر سامعین فن کاروں کے درمیان ایک عجیب ربط پیدا کرتے ہیں۔ ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے اور آپ سٹیج پر جا کر فن کاروں کی ہمت بڑھاتے ہیں، ان کی تیاریوں کا جائزہ لیتے ہیں، انہیں چھوٹی موٹی ہدایات دیتے ہیں اور پھر آ کر اطمینان کے ساتھ سامعین میں بیٹھ جاتے ہیں۔ سامعین میں سے کچھ بے صبر حضرات پردہ اُٹھانے کیلئے چلا رہے ہیں اور آپ اٹھ کر انہیں صبر سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ ایک برجستہ فقرہ کہہ کر انہیں تھوڑی دیر کے لئے بہلاتے ہیں۔ محفل موسیقی منعقد ہو رہی، تو آپ لوگوں کا استقبال اور انہیں قرینے سے بٹھانے کا انتظام کرتے نظر آتے ہیں۔ یا سٹیج پر فن کاروں کو ان کے ساز صحیح حالتوں میں رکھنے میں مدد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ موسیقی کا اَثر قبول کرنے کے لائق ایک ستھرا ستھرا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔ پھر تار چھِڑتے ہیں۔ نغمہ پَرتو لنے لگتا

ہے اور آپ ایسے محو ہو جاتے ہیں جیسے کوئی حسین خواب بن رہے ہوں۔

موسیقی کے ساتھ بخشی صاحب کو ایک والہانہ سا لگاؤ تھا۔ ستار اور سنطور سے لے کر قوالی اور چھکری تک جب کسی صنف کا نام آتا ہے تو آپ پر اس بچے کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے جس نے ماں سے چاند اُتار کر لا دینے کو کہا تھا لیکن آپ چاند کو آئینے میں دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ آپ کو چاند چاہئے۔ جہاں آداب اور تکلفّات رہتے تھے۔ ایسی محفل میں آپ کی تشنگی نہیں مٹتی۔ چھکری، طبلے اور کلرنٹ کے ساتھ ہو رہی ہو، تو آپ اپنے جذبات اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر سکتے۔ اس کیلئے ہارمونیم اور گنگرو ہی چاہیں۔ اگر آداب اجازت نہیں دیتے تو آپ حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہیں گے، جیسے آپ کو چاند نہ لا کر دیا گیا ہو، صرف چاند کا سایہ دکھایا گیا ہو۔

ریڈیو سے متعلق ایک تقریب ہو رہی تھی۔ آپ نے قوالی کے ساتھ ہارمونیم نہیں دیکھا۔ اِستفسار کرنے پر جب آپ سے کہا گیا کہ ریڈیو پر ہارمونیم بجانے کا دستور نہیں، آپ اداس سے ہو گئے۔ یہ کیسا دستور ہے جو آنکھوں میں کاجل نہیں ڈالنے دیتا۔ جو موج ہوا سے کہتا ہے اٹھلا کے نہ چلو۔

تقریب کے اختتام پر کچھ اصحاب نے مزید ایک قوالی کی فرمائش کی اور آپ کو کھوئے ہوئے خواب کے دھاگے مل گئے، اُچھل کر حاضرین سے بولنے لگے۔ واقعی قوالی سن چکنے کے بعد تشنگی کا احساس رہا ہے۔ اِس انجمن میں ہارمونیم بجانے کا رواج نہیں، ہم ایک دوسرا پروگرام مرتّب کرتے ہیں اور......

اور دوسرے ہی دن ہارمونیم سے آراستہ، ایک بے تکلف سی محفل منعقد ہوئی جس میں قوالی کے شائقین پل پڑے تھے!

مصوّری کا احیائے نو یہاں ۱۹۴۷ء کے بعد ہوا لیکن جو سرپرستی اِس فن کو وزیراعظم بخشی غلام محمد کے ذوقِ سلیم کے تحت ملی اور اِس فن نے اپنے جس پرستار کو متوالے بخشی میں پایا، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اب کوئی سال ایسا نہیں جاتا جب تصویروں کی نمائش نہ ہو پاتی ہو اور ہر نمائش میں بخشی صاحب طالبِ دیدار کی طرح آتے تھے۔ دیر تک تصویریں دیکھتے رہتے تھے۔ مصوّروں سے اِنکے بارے میں، اِنکی تصویروں کے بارے میں پوچھتے اور کچھ سوچتے تھے۔ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ، آنکھوں میں وہی جستجو، فراخ ماتھے پر فکر و تخیّل کے وہی سائے، اور آپ اپنے لئے تصویریں چُنتے تھے۔ کسی تصویر کے دام ادا کئے، کوئی تصویر تحفے کے طور پر مانگی......

شاید ریاست کا کوئی ایسا مصور نہیں جس کی قلم کاری کا نمونہ، آپ کے کلیکشن میں نہیں۔ بچوں کی ایک نمائش ہو رہی تھی۔ آپ نمائش کا افتتاح کر رہے تھے۔ تاریک گلیوں کی طرف پلنے وللا ایک بچہ پہلی بار تصویروں کے انعامی مقابلے میں شریک ہو رہا تھا اور پہلی بار آپ کو قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی معصوم سوچوں میں وزیراعظم ایک ایسا پُرشوکت انسان تھا جو بچوّں کے ساتھ گھُل مِل نہیں جاتا۔ آپ نے ایک ننھے سے بچے کو پیار سے تھپکی دی، ایک ننھی سی لڑکی کو پچکارا۔ اس کی سوچیں زور زور سے جھولنے لگیں۔ ''اگر وہ بچہ میں ہوتا، اگر وہ لڑکی میں ہوتا......'' سوچوں کا جھولنا ہچکولے کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انعامات کا اعلان ہوا اور یہی بچہ پہلا انعام لینے کیلئے آپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

بڑی شفقت سے آپ نے شرماہٹ سے ٹمٹمایا ہوا اس کا چہرہ ہاتھوں سے لے کر اسے پیار کیا۔ اس سے کئی باتیں پوچھیں، اُس کی پیٹھ تھپتھپائی ......اور وہ ہواؤں پر قدم رکھتا ہوا سا، واپس اپنی جگہ پر آگیا۔ اُس دن ایک عام سے بچے کی

معصوم دُنیا میں ایک پرائم منسٹر داخل ہوا تھا۔

آج یہ وادی نازاں ہے کہ اس کے بیٹوں کو ایک ایسا رہنما ملا تھا جو قوتِ عمل رکھتے ہوئے حساس بھی ہے کہ جب یہ دو اوصاف ہم کنار ہوتے ہیں تو کلچرل اکادمی قائم ہوتی ہے۔ سکول آف ڈیزائن کھلتا ہے، کلچرل آفس قائم ہوتا ہے۔ جشنِ بہار منا کر یہاں کی بہاروں کا تبسّم، یہاں کے لوگوں میں بانٹا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں جو بہاروں میں رہ کر بھی بہاروں سے دُور تھے۔ صبحِ نشاط اور شامِ شالیمار منا کر یہاں کی صبحوں کا کیف اور شاموں کا سُرور یہاں کے لوگوں پر نچھاور کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں پر، جو کیف اور سُرور کی وادی میں رہتے ہوئے بھی اِن صبحوں اور ان شاموں سے محروم تھے۔ ادیبوں کی مجلسیں ہوتی تھیں، شاعروں کی محفلیں سجتی تھیں، ساز بجتے تھے، گیت گونجتے تھے۔ رنگ چھلکتے تھے اور ایک ایسے سماج کی تعمیر ہوتی تھی جہاں کھیتوں کے ساتھ دِل بھی شاداب رہتا تھا۔

(ماخوذ)

مینارۂ نور

''جب سے تاریخ کا حافظہ شروع ہوتا ہے، کشمیر مذہبی اور رُواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے مینارۂ نور کے طور درخشاں نظر آتا ہے۔ کشمیر کے عظیم مفکروں جیسے للہ عارفہ اور شیخ نور الدین نورانیؒ نے ہمیشہ اتحاد و آشتی کے سرمدی نغمے گائے ہیں۔ اِن جمیل و جلیل آدرشوں کو اپنی رگ رگ میں سمو کر اولوالعزم کشمیری عوام نے ہر مشکل مرحلے پر مذہبی جنون اور تنگ نظری کے خلاف سینہ سپر ہو کر مقدس جدوجہد کی ہے۔

مہاتما گاندھی اور اِن سے قبل کے رُوحانی پیشواؤں نے اِنسانوں کی روحانی طہارت اور سماج کی اخلاقی بلندی کا پیغام دیا ہے۔ ہماری آئندہ خوش حالی کا دارومدار اگر ایک طرف مادی بہبود پر ہے تو دوسری طرف رُوحانی پاکیزگی بھی اتنی ہی اہم ہے۔ کیونکہ ایک متوازن نظامِ حیات کے بغیر سوسائٹی کی حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے جیسے بِن پتوار کے ایک خوبصورت جہاز کی۔ ہماری آئندہ نسلیں اسی صورت میں موجودہ تمدن کے تقاضوں سے صالح طور عہدہ برآ ہو سکتی ہیں جب کہ وہ صحیح طور کشمیر کے شاندار ماضی کی بہترین روایات کی علمبردار ہوں۔ درحقیقت کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں مسرور نہیں بن سکتی جب تک کہ اس کے انفرادی ارکان کے معیارِ اخلاق ثابت نہ ہوں۔ ہم للتا دتیہ، اونتی ورمن اور زین العابدین

جیسے عظیم سپوتوں کے وارث ہیں ۔ ہمارے جلیل القدر بزرگوں نے باہمی بھائی چارے اور فرقہ وارانہ رواداری کی جو مشعل ہمیں سونپی ہے اس کا شعلہ تا ابد تابندہ رہنا چاہیئے ۔ ہمیں اپنے وِرثے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج کیلئے بھی تخلیقی کوششیں کرنا ہیں“ ۔

(بخشی غلام محمد، سرینگر، اوّل جولائی ۱۹۶۰ء)

عہدِ وفا

”زندہ باد کے نعرے یا پھول مالاؤں کے ڈھیر میری رُوح کی پیاس نہیں بجھا سکتے ۔ صرف ایک چیز مجھے حقیقی مسرت سے ہم آغوش کرسکتی ہے ۔ خوش حال عوام کے خنداں اور بشاش چہرے ۔ میں نے بڑے ہلاکت خیز طوفانوں اور سیلابوں میں قوم کی ناؤ کو ساحل مراد تک لے جانے کیلئے ہر مصیبت سے ٹکر لی ہے ۔ میری حقیقی مسرت کا دن جب ہی آئے گا جب میں اس کشتی کو ساحل مراد سے ہم کنار ہوتا دیکھوں ۔ عظیم ہندوستان کی سربلندی اور فلاح کیلئے میں جان کی بازی لگانے پر بھی تیار ہوں“ ۔

(بخشی غلام محمد ۔ سرینگر اپریل ۱۹۵۸ء)

چراغ دین تابشؔ

گوہرِ نایاب

اِک روایت ہے عہدِ بخشی کی
وہ ترقی نہیں ہے جس کا خواب
ہے حکومت عوام کی خادم
بدَلے فرماں روائی کے آداب
فرقِ مزدور پہ ہے دَورِ یقین
اور چہرے کسانؔ کا شاداب
خاکِ کشمیر آج ہے اکسیر
ذرّہ ذرّہ ہے گوہرِ یاناب
تجھ کو بڈشاہؔ و خالدِ کشمیر
اہلِ کشمیر نے دیئے ہیں خطاب

●●●

کشن سمیل پوری

اے خالدِ کشمیر

اے جنت ارضی کے خبردار، خبرگیر' اے خالدِ کشمیر
تہذیب کی، اخلاق کی، اخلاص کی تصویر' اے خالدِ کشمیر
لاریب ہے تو ایک حسین خواب کی تعبیر' اے خالدِ کشمیر
اے خالدِ کشمیر

ہنس ہنس کے تجھے شیخ و صنم دیکھ رہے ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں
اِک ساتھ کھڑے دیر و حرم دیکھ رہے ہیں' ہم دیکھ رہے ہیں
پھر جموں و کشمیر ہیں آپس میں بغل گیر' اے خالدِ کشمیر
اے خالدِ کشمیر

دھوئیں ہیں زمانے میں ترے قلب صفا کی اور عہدِ وفا کی!
بے باکی و حق گوئی و عدل لئے ہمتا کی اِک ایک اُدا کی
اے محسنِ اعظم مرے، اے عزم کی تصویر، اے خالدِ کشمیر
اے خالدِ کشمیر

محسن مرے! تجھ کو نیا ساون[1] ہو مبارک گلشن ہو مبارک
غنچوں کی پھبن، پھولوں کا جوبن ہو مبارک دامن ہو مبارک
سو بار مبارک تجھے یہ عزت و توقیر، اے خالدِ کشمیر
اے خالدِ کشمیر

---

[1] خالد کشمیر کی سالگرہ ساون میں پڑتی ہے

الزبتھ پارٹرچ

مردِ خلیق

اوہو! اس شام کو کیسا تماشہ تھا۔ میرے لئے سرینگر میں قاصد اور جیپ دوڑ رہے تھے اور آخر کار میں بازار میں ایک کشمیری ٹوپی کی تلاش میں سرگرداں پائی گئی (مگر مجھے سیاحی ہیٹ نہیں چاہئے مجھے تو معمولی کشمیری ٹوپی چاہئے۔ ایسی جیسی کہ سب اوڑھے پھرتے ہیں'')

پبلک ریلیشن آفیسر نے ذرا ملامت آمیز آواز میں کہا کہ ''کیا تم بخشی صاحب سے اِنٹرویو نہیں چاہتیں؟''

''یقیناً میں اِنٹرویو تو چاہتی ہوں...... ضرور چاہتی ہوں''۔

''تو وہ آپ کو آدھے گھنٹے میں گنگاہل میں ملیں گے''

''بس ٹھیک ہے، میں چہل قدمی کرتی ہوئی پہنچ جاؤں گی''۔

ٹیلیفون ایسا معلوم ہوا کہ پھٹ جائے گا۔ جب آواز آئی......

''ارے۔ آپ پیدل نہیں پہنچ سکتیں، دیر ہو جائیگی۔ گنگاہل تو بارہ[12] میل ہے۔

''اچھا خوب! میں سمجھتی تھی کہ بخشی صاحب کی کوٹھی کا نام گنگاہل ہے''۔ آخر سب ٹھیک ہوا اور میں ایک جیپ میں گنگاہل کی طرف چلنے لگی۔ ایک ہمدرد کشمیری جیپ کا ڈرائیور تھا...... اور اس کے سر پر وہی کشمیری ٹوپی تھی جس کی مجھے اتنی تلاش تھی۔

ہاری پربت کے دامن میں ہماری جیپ خوبصورت دیہات میں اُڑی چلی جارہی تھی۔ ڈھول، مرغی کے بچوں اور حسین بچوں کے کھیل کود میں سے ہوتی ہوئی وادی میں داخل ہوئی جس کے مناظر ہمیشہ مجھے حیرت میں ڈالتے تھے وہ بھورے سبز پہاڑ اور نیلگوں آسمان کا پس منظر جہاں سفید سفید بادل کے ٹکڑے مست رفتار کے ساتھ چل رہے تھے۔ اِس کے مقابلہ میں قریب ہی کشمیری حسین دیہات اور سبز وزرّیں کھیت اور دَرخت جو ہُوا کے اثر میں مستانہ وار جھُوم رہے تھے۔ چاول کی تیار فصلیں جن سے زرخیزی ثابت ہوتی تھی اور جوتی ہوئی زرّیں زمین جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دَولت اُگتی ہے اور مسرّت کی فضا بناتی ہے۔ یہ رُوح پرور مناظر قابلِ دید تھے۔

آخر گنگا ہل آگیا۔ پل کو پار کرتے ہی سُرخ کپڑے پر ''خوش آمدید نمایاں نظر آیا۔ جشن کشمیر، گنگا ہل پہنچ چکا تھا اور چاروں طرف اس کی جگمگاتی روشنیوں کا دورہ ایسا تھا کہ گویا وینس میں روشنیوں کا کارنیوال ہو۔

آدمیوں کے ہجوم اور چناروں کی قطاروں کے درمیان کسی نے رہنمائی کر کے مجھے اِس تقریب میں پہنچا دیا جہاں میلوں دُور سے دیہات کے لوگ آ آ کر جمع ہوئے تھے اور ہر چہار طرف لُطف و مسرّت کی فضا تھی۔ جس کو دیکھو، مگن تھا اور موسیقی کے ساتھ ساتھ جھُوم جھُوم کر سَر ہلاتا اور پاؤں حرکت میں لاتا تھا۔ چناروں پر موسمِ خزاں کی آمد کے اُثرات ظاہر ہو چکے تھے اور اِس حسین فضا میں ہر ایک پر خاص حالت طاری تھی اور ہر ایک وہی ٹوپی پہنے نظر آرہا تھا جس کی مجھے اتنی تلاش تھی۔

ڈائس کے قریب پہنچے تو مجمع کو چیر کر مجھے بخشی صاحب تک پہنچایا گیا جو دہلی کے دو مہمانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔

سکاؤٹس کی پریڈ کا معائنہ
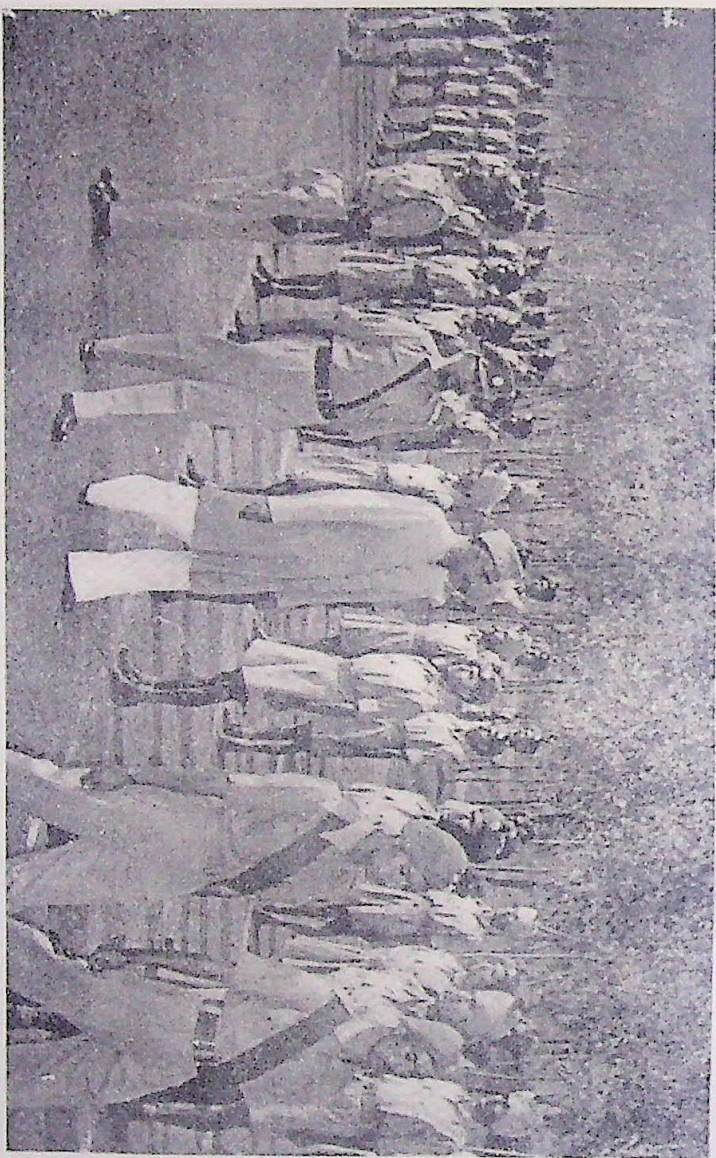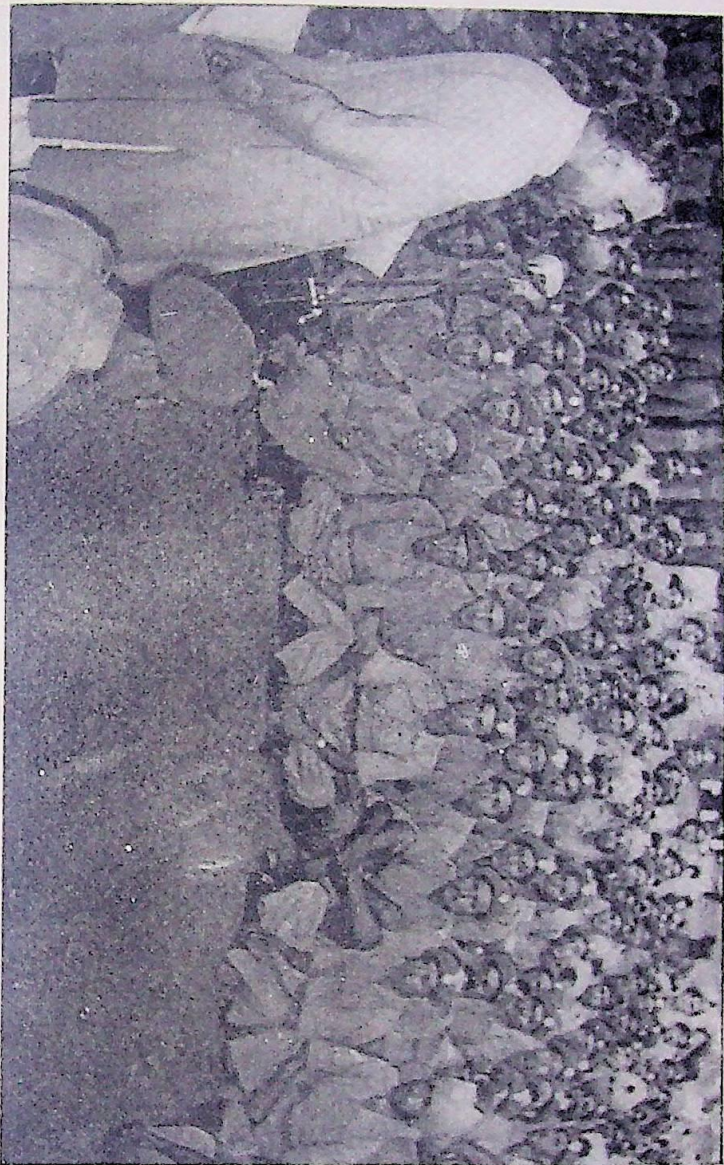
بخشی غلام محمد۔ سکاؤٹس سے خطاب

ثقافتی گروپ کے اراکین کے ساتھ

''ارے آپ یہاں کہاں؟ مگر وہ وہاں بیٹھ ہی گئی اور پروگرام دیکھنا شروع کر دیا۔ میری خوش قسمتی کہ وہی فن کار کشمیری رقص کا مظاہرہ کر رہا تھا جو میرا دل پسند ہے۔ جشن کی ابتداء میں...... ....شالیمار کے دیوالی جیسے پروگرام میں اس کا رقص دیکھا تھا مگر وہاں وہ شرما رہا تھا۔ آج کھل کر بے تکلّف کام کر رہا تھا۔ شالیمار کا بھی کیا منظر تھا۔ جھرنوں کے پیچھے سے چراغوں کے جھلملانے کا سماں قابلِ دید تھا۔ آج کی موسیقی نے محو کر دیا تھا۔ اِس کی کمر، گردن، سر، بھوئیں سب اِس طرح کام کرتی تھیں کہ سب تالیاں بجاتے تھے اور پھر جب اس نے ایک دہاتی عورت کی روزمرّہ زندگی کا سماں کھینچا اور بتایا کہ کس طرح وہ روٹی پکاتی۔ کپڑے دھوتی اور پھر سُرمہ لگاتی ہے۔ جب سُرمہ لگاتے ہیں ایک آنکھ میں کھٹک کا منظر پیش کیا تو لوگ پھڑک گئے۔ وہ تو اور زیادہ اُپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا مگر پروگرام بہت طویل تھا۔ افسروں نے مائیکروفون اُس سے بڑی مشکل سے چھینا تا کہ دوسری چیزوں کا نمبر آئے۔ ابھی اِسے روکنے کی کوشش ہی ہو رہی تھی کہ یکایک بارش آگئی۔ ہمارا ڈائس تو چناروں کے سایہ میں تھا مگر بخشی صاحب جھپٹ کر بارش میں پہنچے اور تمام مجمع کو اِس طرح جیسے چرواہا بھیڑوں کو احتیاط سے لاتا ہے۔ درختوں کے سائے میں لائے اور وہ بھیگے ہوئے مگر خوش وخرّم ڈائس پر واپس آئے اور پھر ایک درخت کے نیچے کھڑے انتظار کرنے لگے کہ بارش کب رُکتی ہے۔ میرے خواب وخیال میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کوئی وزیر اعظم عوام کے ساتھ اتنا بے تکلّف بھی ہوسکتا ہے۔ کھڑے کھڑے ایک موٹے گیروا کپڑوں والے شاعر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور اِس کو سگریٹ پیش کر رہے تھے۔ اس۔ کہ بعد ایک چھوٹے سے ڈاک بنگلہ میں ہم سب انٹرویو کیلیۓ

چلے گئے جہاں چائے پیتے پیتے ہم سوالوں کی بارش جس تیزی سے کرتے رہے اسی تیزی سے وہ جوابوں کی بارش کرتے رہے۔ وہ وقت سے آگے رہتے تھے۔ چونکہ ان کا دماغ فوری فیصلہ کرتا تھا اور وہ فوری عمل کر ڈالتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا مجھے جشن کے اس پہلو سے بڑی مسرت ہے کہ عورتیں اتنی بڑی تعداد میں آئیں۔..................... (نامکمل)

مرحلۂ شوق

اگر ہم حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو خوشحال اور مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں تساہل پسندی کو خیر باد کہہ کر خون پسینہ ایک کر کے مشقّت کی راہ اپنانا ہوگی۔ بے شک ہم نے بہت سے مرحلے طے کرنے ہیں مگر ہمارے خوابوں کی منزل ہماری لگن کا اور امتحان چاہتی ہے۔ ہمارے ملک کے تمام باشندوں، بچوں، بوڑھوں، نوجوانوں اور عورتوں کو ملک کے وقار کو بلند رکھنے کیلئے محنت اور بے لاگ محنت کا راستہ اپنانا ہے۔ ہمارا نعرۂ مستانہ یہی ہونا چاہئے۔ ''محنت کرو اور جی لگا کر محنت کرو!'' ....

(بخشی غلام محمد، ادھم پور۔ ۲۶ر اپریل ۱۹۵۹ء)

☆☆☆
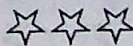
ساگر چند مہاجن

چائے کی دُو پیالیاں

میں نے میز پر پڑی ہوئی چائے کی پیالی کی طرف دیکھا اور معاً تاریخ اُوراق پلٹتی ہوئی کئی سال پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

لاہور کی ایک سنسان سڑک، آدھی رات کا سماں، اخبار کا دفتر، غنودگی کا عالم، آنکھیں کچھ کھلی کچھ بند اور پریس کیلئے آخری کاپی کی دوڑ دھوپ، دنیا بھر کے ہنگامے، لیڈروں کے بیانات، گاڑیوں کی ٹکر، چار بچوں کی ماں کا کنویں میں کودنا۔ یہ سب کچھ میرے سامنے تھا پھر بھی وہ رات عام راتوں کی طرح بے کیف تھی۔ دنیا کی ہر واردات کو میں کسی قسم کے تاثر کے بغیر اخبار میں مناسب جگہ دے رہا تھا۔ ایسے میں نہ معلوم کب عقابی نگاہوں والا ایک کشمیری نوجوان میرے برابر میں آ کر بیٹھ گیا۔

بخشی غلام محمد کا آدھی رات کے وقت ہمارے دفتر میں پہنچ جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ اُن دنوں جموں و کشمیر میں ایک زبردست انقلاب جنم لے رہا تھا۔ ریاست کے چاروں کونوں میں ایک ہنگامہ خیز تحریک چل رہی تھی جسے تقویت دینے اور راعی اور رعایا کی باہمی کشمکش کے بارے میں کچھ غلط فہمیوں کا اُزالہ کرنے کیلئے ریاست سے باہر بہت کام کرنے کی ضرورت تھی، یہی مقصد سامنے رکھ کر بخشی غلام محمد اور ان کے کچھ دوسرے ساتھی انتہائی بے سروسامانی کی

حالت میں برطانوی ہند میں پھیل گئے تھے اور ہر چھوٹے بڑے کانگریسی اور غیر کانگریسی لیڈر کو اپنی تحریک کی غرض وغایت سمجھا رہے تھے اور اپنا ہمدرد بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ ریاست کی تحریک آزادی میں غضبنا کی پیدا کرنے والے یہی نوجوان تھے۔ انہوں نے اپنے اخلاص سے بہت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اُن کے دماغ سکیموں سے بھرے رہتے تھے۔ ان کی زندگی ادھیڑپن کی زندگی تھی۔ بارہا انہیں کھانا کھانے کی فرصت بھی نہ ملتی۔ میرا خیال ہے کہ اس رات بھی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ میں نے چپراسی سے کہا اور اس نے نیچے دُوکان سے (جو ہم اخباروں کیلئے رات دیر تک کھلی رہتی تھی) چائے کی ایک پیالی لاکر بخشی صاحب کے سامنے رکھ دی۔

اور کل جب بخشی صاحب کی کوٹھی پر میرے سامنے چائے کی ایک پیالی رکھی گئی تو اچانک مجھے اس پیالی سے بھاپ اُٹھتی دکھائی دی جو ایک رات میں نے ان کے سامنے رکھی تھی۔ اِن دُو پیالوں کے درمیانی وقفے میں دُنیا بدل چکی تھی۔ میں نے تاریخ کے دُھندلکے میں ایک پرجوش نوجوان دیکھا جو بار بار کہہ رہا تھا کہ ریاستی حکام کا فلاں بیان غلط ہے۔ وہ کس طرح کہتے ہیں کہ یہ تحریک فرقہ پرستوں نے چلا رکھی ہے۔ وہ مصر تھا کہ شخصی حکومت کے خلاف ریاست کے سبھی ہندو مسلمان اور سکھ متحد ہیں۔ ریاست کی لڑائی ہندو اور مسلمان کی لڑائی نہیں بلکہ یہ جابر و مجبور کی لڑائی ہے۔ اس نے کہا کہ مہاتما گاندھی نے ان سب باتوں کو غور سے سنا ہے۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں اور چمک اُٹھیں۔

میں نے کہا بخشی صاحب جگہ ہو یا نہ ہو۔ یہ سب باتیں صبح کے اخبار میں ضرور چھپ جائیں گی۔ آپ چائے تو پیجیے۔ اس وقت تک چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

چائے کے پیالے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے بیتے ہوئے کچھ برسوں پر نظر دوڑائی ۔ ان برسوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی لیکن کتنے طوفانوں میں سے گزرنے کے بعد۔ اس عرصے میں کتنے سیاسی اتھل پتھل ہوئے ، زبردست آندھیاں چلیں اوران آندھیوں میں میں نے بخشی غلام محمد کونہایت متانت اوروقار کے ساتھ گرتوں کوسنبھالتے اوراغیار کوللکارتے دیکھا۔ بڑے بڑے سیلاب آئے لیکن یہ سیلاب اس کی آنکھوں کی چمک اوراس کے ہونٹوں کا تبسم کونہ لے جاسکے ۔ یہ وہ دولت تھی جو چرائی نہ جاسکی ۔ غریب ماں باپ کا یہ ہونہار فرزندفولادی انسان کہلانے کے باوجود چاروں طرف موتی بکھیرتا رہا۔

میں سوچنے لگا اگر آسمان کشمیر پر یہ ستارہ جلوہ گر نہ ہوتا اگر ہمالیہ کی خوبصورت گود میں اس بچّے نے پرورش نہ پائی ہوتی ۔ اگر افلاس اسے بچپن میں غریبوں کے دلوں کی دھڑکنوں سے شناسا نہ کرتا تو تاریخ کے کئی اوراق کسی مختلف انداز سے لکھے جاتے۔

میں سوچ رہا تھا کہ کسی نے پکارا چائے توپیجئے۔ اس وقت تک چائے بالکل ٹھنڈی ہوچکی تھی۔

غلام قادر اندرابی

ہدیۂ عقیدت

(بڈگام کے ایک عوامی جلسے میں پیش کیا گیا)

ہجوم خلق کا بڈگام کی تاریخ میں یہ کیا؟
عظیم المرتبت جلسہ ہے پہلی مرتبہ ایسا!

کس کی عظمت و شوکت یہاں پر رنگ لائی ہے
یہ لمحات مسرت زا میں کیوں نغمہ سرائی ہے

خدا جانے کہ کس کس وجد میں ہیں لوگ یاں آئے
اُمیدیں باندھ کر آئے مقاصد لاد کر لائے

انہیں کس رہنما قائد کی شوقِ دید لائی ہے
کہ ان پر اس قدر وافر یہ ذوق دید چھائی ہے

حصول علم کے دلدادہ اسکولوں کے طالب ہیں
عوام الناس کے خادم مسائل لے کے آئے ہیں

یہ جرأت بے محابا مانگنے کی جس نے بخشی ہے
یہ دریا دل ہمارا خالد کشمیر بخشی ہے

یہ رسم افتتاح رہ مبارک ہو، مبارک ہو
یہ تاریکی کے بدلے نور کا پرتو مبارک ہو

سازبھی، شمشیر بھی!

گاندربل کے گردونواح میں بسنے والے دیہاتیوں کیلئے ۱۹۵۹ء کا سیلاب ایک اچانک آفت کی طرح آن جھپٹا۔ سندھ ندی، جو ہولے ہولے بڑی روانی کے ساتھ بہتی تھی اچانک پرغضب ہوگئی اور گاؤں کی ہر چیز سیلاب کے خونی جبڑوں میں آگئی۔ دھان کے لہلہاتے کھیت جھیلوں میں تبدیل ہوگئے۔ کھیر بھوانی سے بیہامہ کی سڑک ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور تناور درخت اُکھڑ کر گر گئے تھے۔ چاروں طرف تباہی اور بربادی کے منحوس بھوت رقص کررہے تھے۔

اِس مایوس کن صورت حال میں بخشی صاحب گاندربل پہنچے۔ بخشی صاحب سیلاب کے آغاز سے ہی دن رات ایک کر کے ہر خطے کے مقام کا جائزہ لے رہے تھے اور بندوں کی مرمت مصیبت زدوں کی امداد اور انسدادی تدابیر کے مختلف اقدامات کی خود نگرانی کررہے تھے۔ بخشی صاحب کے پہنچتے ہی گاندربل میں ایک ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ لوگ انہیں اپنی اجتماعی اور انفرادی بپتا کا ماجرا سنانے لگے اور اس بات پر زیادہ تشویش ظاہر کرنے لگے کہ یہ تباہی اور بڑھے گی کیونکہ آسمان کا غیض ابھی تھمنے نہیں پاتا۔ جموں اور کشمیر کا وزیراعظم جسے مردِ آہن کے لقب سے پکارا جاتا ہے یہ حال سن کر متاثر ہوا اور انہیں اس بات کی فکر دامن گیر ہوئی کہا کہ اس ناممکن صورت

حال کا کیسے مقابلہ کیا جائے۔ ان کے تھکن سے بھرپور بشرے پر تفکر کی کیفیات طاری تھیں مگر اب وہاں ایک بشاش رنگ بھی چھا گیا۔ ایسے معلوم ہوا کہ ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ایک جواب اُبھر رہا ہے۔ اَچانک اُن کی طبیعت کے جری عنصر نے انگڑائی لی اور انہوں نے گاؤں والوں کو پُرعزم رہنے کی ہدایت کی۔ انہوں نے گاؤں والوں کے دل ٹٹولتے ہوئے ان سے بات چیت شروع کی۔

''یقین اور ہمت سے کام لیجئے۔ سارے بادل چھٹ جائیں گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ تباہی کا ایک نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہم دریا کو اپنا پُرانا راستہ اپنانے پر مجبور کریں گے۔ ہم بندھوں کی تعمیر کریں گے اور راستوں کو بحال کریں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی شخص کو بھوکا یا بیمار نہیں رہنے دیا جائیگا۔ اور گارے سے بنے ہوئے مکانوں کی تباہی کا افسوس کرنا بے حاصل ہے کیونکہ ہم آپ کے اور آپ کے بال بچوں کی رہائش کیلئے ہوادار اور روشن مکانات تعمیر کریں گے۔ یہ سب اِسی صورت میں ہوسکتا ہے جب آپ ہمت اور ا یکتا سے کام لیں''۔

وزیراعظم پُراعتماد لہجے میں بول رہے تھے اور مایوس فضا میں امید کی قوس قزح لہرا اُٹھی۔

اِتنے میں ایک معمر دہقان آگے بڑھا۔ اُپنے بازو آسمان کی جانب بلند کر کے اُس نے بڑے جذباتی لہجے میں ان سے خطاب کیا۔

''سیلاب نے ہماری تمام چیزوں کو نگل لیا ہے مگر اسکا غم نہیں کیونکہ خوشحالی کی منزل تک پہنچانے کیلئے آپ کا سایہ موجود ہے۔ ہم آپ کی رہنمائی میں ہر کوئی کام کرنے کیلئے تیار ہیں''۔

اس آواز کی بازگشت میں عوام کا نعرہ گونجا جس سے فضا سرشار ہوگئی۔ یہ

آواز دلوں سے دعا بن کے نکلی تھی۔ ’’ہمارا رہنما مدت دراز تک زندہ رہے‘‘۔

ماہ جولائی کی اکیس تاریخ کو یہی دُعا ہر ریاستی باشندے کی زبان پر ہوگی۔ کیونکہ یہ اُن کی سالگرہ کا مبارک دن ہے۔ سیلاب ہو یا قحط، آگ ہو یا کوئی اور آفت۔ عوام نے ان کی صورت میں ہمیشہ ایک رفیق رہنما اور غمگسار کا مشادہ کیا ہے۔ بحران اور مصائب کے وقت ان کے آہنی ارادے نے عوام کی امنگوں کو شاداب کر کے انہیں پھر سے آمادہ عمل کیا ہے۔ بزُدل اس کے پَرتوَ سے شیر دل بن جاتے ہیں۔ انتشار اس کے سائے سے تنظیم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر مصیبت کو اس کا باتدبر ذہن ترقی کی نئی تحریک بناتا ہے۔ مشکل اوَقات میں بخشی غلام محمد کی ہمت اور قوت شدت سے ابھر آتے ہیں اور وہ رکاٹوں کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ذہن میں مستقبل کی تصویر اجاگر رہتی ہے۔ سیلاب کی طغیانیوں میں وہ اس تعمیر کا خواب دیکھتے ہیں جو پانی اُترتے ہی انہیں اور ان کے عوام کو شروع کرنا ہوگا۔ ایک سچے آمیُد پرست کی طرح وہ بادلوں کی غضبناکی میں اُن کے چھٹ جانے کا سماں دیکھتے ہیں۔ اور وقت گواہ ہے کہ اِس آہنی عزم کے آگے مشکلات نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اُن کے نکتہ چیں بھی اِس بات کے قائل ہیں کہ ایک صاحبِ نظر اولوالعزم رہنما کی حیثیت میں ملک بھر میں انکے پایہ کے لوگ بہت کم ہیں اور ریاست میں تو کوئی بھی نہیں۔ شیخ محمد عبداللہ کے ایک رفیق کا کہنا ہے کہ ریاست کی سلامتی اور انتشار کے درمیان جو چٹان کھڑی ہے اس کا نام بخشی غلام محمد ہے۔

●●●

رشید تاثیر

بخشی غلام محمد

جناب بخشی غلام محمد کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے اُن معروف و منفرد سیاستدانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی فہم و فراست سے ریاست کی سیاسی تاریخ میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ ایک با مقصد، اِرادے کے پکے اور بیدار مغز سیاستدان تھے۔

وہ ۱۴ر جنوری ۱۹۰۷ء کی خنک اور یخ بستہ شب کو چھتہ بل سرینگر میں ایک اوسط درجے کے گھرانے میں تولد ہوئے۔ اُنکے والدِ بزرگوار کا نام عبدالغفار بخشی[1] تھا۔ بخشی غلام محمد اپنے چھ بھائیوں (غلام نبی، علی محمد، ولی محمد، عبدالمجید، عبدالحمید) اور دو بہنوں (عائشہ اور زونی) میں سب سے بڑے تھے۔ ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد نے چھتہ بل کو خیر باد کہہ کے خانقاہ سوختہ میں سکونت اختیار کی[2]۔ اس طرح بخشی غلام محمد کی تعلیم و تربیت اُن کے ماموں غلام قادر خان[3] کی سرپرستی میں ہوئی۔ بخشی صاحب نے نویں[4] جماعت تک تعلیم حاصل کی اور[5] ۱۹۲۹ء میں چرچ مشن[6] کے لیہہ میں قائم کردہ پرائمری سکول میں بحیثیتِ اُردو معلّم کے پانچ سال کے شرطیہ قیام کے اقرار پر لداخ[7] چلے گئے۔ ان کے لداخ پہنچنے کے بعد ان کے عزیز و اقارب دوست احباب میں یہ افواہ شدّت سے گشت کرنے لگی کہ

انہوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا ہے اور انہیں جوزف نام سے پکارا جاتا ہے[8]۔ ان کے اہلِ خانہ کیلئے یہ بڑی تشویش ناک خبر تھی۔ انہوں نے ٹینڈل بسکو کے سامنے یہ بہانہ بنایا کہ ان کی شادی ہونے والی ہے انہیں فوراً سرینگر واپس لایا جائے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں وہ واپس سرینگر آ گئے[9] اور اِسی برس ان کی شادی ہوئی۔ اس طرح بخشی غلام محمد نے دوبارہ واپس لداخ جانے کے بجائے ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ سرینگر میں واقع کھادی بھنڈار میں بحیثیتِ سیلز مین کے ملازمت اختیار کی[10]۔ ۱۹۳۱ء میں انہیں منیجر کے عہدے پر ترقی دے کر لاہور بھیجا گیا۔ دسمبر ۱۹۳۶ء میں کھادی بورڈ نے لاہور کا برانچ بند کیا اور بخشی غلام محمد سرینگر کھادی بھنڈار کے منیجر کی حیثیت میں واپس آئے۔

۱۳؍ جولائی ۱۹۳۱ء کے سانحہ کے بعد وادی کشمیر ریاستی انقلابیوں کا مرکز بن چکا تھا[11] اور لوگوں میں بیداری کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی تھی جس پر قابو پانا جاگیردارانہ نظام کے بس کا روگ نہ تھا۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں گلانسی اصلاحاتی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس کے تحت ریاستی عوام کو بنیادی انسانی حقوق اور پریس و پلیٹ فارم کی محدود آزادی نصیب ہوئی۔ اُن ہی دنوں کشمیری پنڈتوں نے روٹی مومنٹ کے نام سے ایجی ٹیشن شروع کی جس کو جاگیردارانہ نظام نے چٹکی بجاتے دفن کیا۔ اس سے حکومت کے حوصلے بڑھے اور اس نے گلانسی سفارشات کو روبہ عمل لانے میں لیت ولعل سے کام لینا شروع کیا۔ حکومت کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت سے ریاستی مسلمانوں میں دَبی ہوئی بے چینی اُبھر آئی۔ مفتی ضیاء الدین ضیا پونچھی نے اس کے خلاف اپنی ایک تقریر میں حکومت کو انتباہ کیا جس کے بعد ایک بار پھر وادی کشمیر کے آزادی پسندوں نے ایجی ٹیشن کی راہ اختیار کی جس کے نتیجہ میں مہاراجہ کے حکم پر جامع مسجد سرینگر کے بیرونی احاطہ میں جمع لوگوں پر بے تحاشا گولیاں

برسائیں گئیں اور چار افراد جاں بحق اور بے شمار زخمی ہوئے۔ لوگوں نے خوف اور بربریت کے اس عریاں ناچ سے دہشت زدہ ہوکر جامع مسجد کے چاروں دروازوں کو بند کرلیا۔ گوکہ اس وقت تک بخشی غلام محمد نے ریاستی سیاست میں براہ راست کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن بدلتے ہوئے حالات اور سیاسی افق کے مدوجزر سے بے نیاز بھی نہ تھے۔ اِس روز جامع مسجد کے محصورین میں وہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے مسجد[12] میں جمع لوگوں کے سامنے کھڑے ہوکر پہلی بار ایک طویل ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا:

''اِس فرسودہ اور جابرانہ نظام کو نابود کرنے کیلئے مجھے ایک کم دس ہزار جانبازوں کی ضرورت ہے۔ ایک کی کمی کو پورا کرنے کیلئے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں اور اس ظالم حکومت کی پہلی گولی کیلئے میں اپنا سینہ پیش کروں گا۔ مسجد کے دروازے کھول دیجئے میں دیکھتا ہوں کہ یہ نکمی حکومت ہمارا کیا بگاڑتی ہے۔''

اِس پُرجوش تقریر کے بعد جوش وخروش سے بھرپور مجمعے نے مسجد کے دروازے وا کیئے اور بیرونی احاطہ سے ہوتے ہوئے نوہٹہ چوک میں پہنچتے ہی لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان سے آملی۔ بخشی غلام محمد کی اِس پہل سے مسرور ہوکر ان کے حق میں کھدر بھنڈار کی نسبت سے غلام محمد گاندھی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ اس طرح بخشی صاحب ریاستی سیاست میں داخل ہوئے۔ بخشی صاحب کی بات کرتے وقت تحریک حریت کشمیر کے تمام تر مراحل اور واقعات کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ مضمون بخشی صاحب کا سیاسی خاکہ بھی ہے۔

دریں اثنا میر واعظانِ کشمیر کے درمیان باہمی پرانی رقابتیں ژیکہٕ کوٹہٕ کے

نام سے عود کر آئیں جس نے آگے چل کر شیر بکرا نام کے شرمناک تنازعہ کو جنم دیا اور بنیادی انسانی حقوق کی ضمانتیں تلاش کرنے والوں پر حیوانیت کی رعونت غالب آئی۔ اِس طرح لوٹ مار کا ایک نیا باب کُھلا جس میں یا علی کا نعرہ دے کر نرغہ میں پھنسے ہوئے کی پگڑی 'ململی' کہہ کر اُتاری جاتی تھی اور حیدری کے جواب میں 'ژادری' یعنی چادر سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس عبرت انگیز ماحول میں بڑے بڑے اپنے ہوش وحواس قابو میں نہ رکھ سکے۔ بخشی غلام محمد کے فرائض منصبی میں قائدین کے تنظیمی دورہ کا پروگرام مرتّب کرنا اسے روبہ عمل لانا، مسلم کانفرنس کے جلوسوں کی بحثیت سالارِ اعظم آگے آگے گھوڑے پر سوار ہوکر پیشوائی کرنا شامل ہوئی[۱۳]۔ بخشی صاحب کی اِن ہی صلاحیتوں کے باعث ۱۹۳۴ء میں جب مجاہد منزل تعمیر کرنے کا اہتمام ہُوا انُہیں اِس پروجیکٹ کا مہتمم خصوصی قرار دیا گیا۔ ۲۱ رمئی ۱۹۳۴ء کو ریاستی حکومت نے بخشی غلام محمد کو سرکار کے خلاف نفرت پھیلانے کے جرم میں گرفتار کرکے ریاسی جیل بھیج دیا[۱۴]۔ یہ بخشی صاحب کی پہلی سیاسی گرفتاری تھی۔ مسلم کانفرنس کی تنظیم میں انکی گرفتاری کے ساتھ ہی وہ عنصر جو اُن کی شہرت، صلاحیتوں اور انوکھے طرزِ تنظیم سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ بخشی صاحب پر یہ الزام لگانے سے باز نہیں رہے کہ انہوں نے مجاہد منزل کی تعمیر کے ضمن میں آئے ہوئے عوامی چندہ کا خرد برد کیا ہے جبکہ تحقیقات کے بعد یہ الزام بے بنیاد ثابت ہوا۔ چنانچہ شیخ محمد عبداللہ جنہیں ۱۹۵۳ء کے بعد بخشی صاحب کے ساتھ ہر سطح پر شدید اختلافات رہے اور اکثر وبیشتر ان کیخلاف بولتے رہے۔ بخشی غلام محمد کے مجاہد منزل کی تعمیر وحفاظت کے جذبہ ایثار کی تعریف کئے بنا نہ رہ سکے ہیں۔ اس سلسلے میں 'آتش چنار' میں صفحہ ۲۴۲ پر یوں رقمطراز ہیں:

اس امر کا اعتراف برحق ہوگا کہ بخشی غلام محمد نے مجموعی حیثیت سے اس عمارت (مجاہد منزل) کی حفاظت کی اور بعد میں اسے اوقاف کے سپرد کردیا۔

۱۹۳۵ء میں مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے پنڈت پریم ناتھ بزاز کے اشتراک سے ہفت روزہ 'ہمدرد' سرینگر سے جاری کیا اور ۱۹۴۱ء میں جموں و کشمیر آرمز ایکٹ یا ہندی رسم الخط کے معاملے پر اِن دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ پریم ناتھ بزاز نے نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کی جس کے نتیجہ میں 'ہمدرد' کے مالکانہ حقوق زیر بحث آئے۔ شیخ صاحب معززین کے کہنے پر قریب قریب اس بات پر راضی ہوئے کہ پنڈت پریم ناتھ بزاز کو 'ہمدرد' کے جملہ حقوق بغیر کسی معاوضہ کے تفویض کئے جائیں لیکن مولانا سعید مسعودی اور بخشی غلام محمد اس بات پر بضد رہے کہ اس سے معاوضہ لیا جائے۔ ڈاکٹر پشن کو ثالث مقرر کیا گیا اور ان کے فیصلہ کے مطابق پانچ ہزار روپے لے کر شیخ صاحب 'ہمدرد' کے حقوق سے دستبردار ہو گئے۔ اس واقعہ کو دہرانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مولانا مسعودی کے دوش بدوش بخشی غلام محمد کی رائے بھی شیخ صاحب کیلئے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

اخبار 'ہمدرد' کے حوالے سے یہ کہنا بعید از معلومات نہ ہوگا کہ پنڈت پریم ناتھ بزاز اور مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے پنڈت جواہر لال نہرو سے تعلقات قائم کرنے کیلئے ہفت روزہ ہمدرد کو ہی اپنا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۳۶ء میں مولانا محمد سعید مسعودی ایڈیٹر ہمدرد نے اخبار کی مکمل فائل پنڈت جی کے مطالعے کیلئے مالکان کی ہدایت پر الہ آباد بھیجی اور اس کے بعد پنڈت بزاز اور شیخ صاحب نے اُن کے نام اپنا پہلا مشترکہ خط فائل کے حوالے سے پنڈت نہرو کو کشمیر آنے کی دعوت کا پیغام دے کر بھیجا۔ اس مکتوب نے آدھے تعارف کا کام دیا۔ ۱۹۳۷ء میں لاہور ریلوے

اسٹیشن پر شیخ محمد عبداللہ نے بخشی غلام محمد کے ہمراہ پنڈت جی سے ملاقات کی۔ شیخ صاحب انکی دعوت پر صوبہ سرحد کے دَورے پر گئے اور بخشی صاحب اِس ملاقات کے خوشگوار تاثرات لے کر سرینگر لوٹ آئے۔

۷رجون ۱۹۴۷ء کو پنڈت شیو نرائن فوطیدار نے کشمیری پنڈت برادری کو شیتل ناتھ کے احاطہ میں بھاشن دیتے ہوئے ایک ایسی بات کہہ دی جس سے مسلمانوں کی دلآزاری ہوئی۔ یہ خبر ۸رجون ۱۹۴۷ء کو اخبار مارتنڈ سرینگر میں شائع ہوئی اور اس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ وہ مشتعل ہو گئے اور میر واعظ مولانا یوسف شاہ کی قیادت میں اِس واقعہ کے خلاف جامع مسجد سرینگر سے ایک پُرامن احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ بہوری کدل کے قریب پولیس نے جلوس کو روکنے کی غرض سے گولی چلادی جس کے نتیجے میں ایک شخص شہید ہو گیا۔ اہلِ جلوس نعش لے کر بھانہ محلہ پہنچے جہاں پولیس نے اُن پر حملہ کر کے نعش کو اپنے قبضہ میں لیا۔ میر واعظ کو ان کے پانچ ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا۔ اُن دنوں شیخ صاحب نیج بہاڑہ میں تھے۔ انہوں نے اس سانحہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

مذہب کسی کی میراث نہیں، اگر میر واعظ دوپہر کا کھانا جیل میں کھاتے ہیں تو رات کے کھانے پر ہم اُن کے شریکِ دسترخوان ہوں گے۔

ان حالات سے خوفزدہ ہو کر پنڈت فوطیدار خبر کو اخبار مارتنڈ کی غلط رپورٹنگ قرار دے کر مسلم کانفرنسی لیڈروں کے قدموں پر پکے سیب کی طرح گر کر معافیاں مانگنے لگے۔ کچھ دن بعد بخشی غلام محمد نے فوطیدار صاحب کو ایک کھُلی موٹر کار میں اپنے ہمراہ سوار کر کے مہاراج گنج اور شہر کے دوسرے اندرونی علاقوں میں گشت لگایا، جس کا ظاہری اور باطنی مقصد یہ تھا کہ فوطیدار نے معافی مانگ لی ہے

اور مسلم کانفرنسی رہنماؤں نے اسلامی روایات کے مطابق اِسے معاف کیا ہے۔ شیخ صاحب 'آتش چنار' میں اِس واقعہ کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"......وہ ہماری پناہ میں آ گئے۔ ہم نے انہیں پریشان دیکھا تو ہم نے اپنے کارکنوں کے ہمراہ ایک کھلی کار میں انہیں شہر میں گھمایا جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ شخص پشیمان ہو کر اب معافی مانگ رہا ہے لہٰذا معاملے کو اب ختم کرنا چاہیے"۔

شیخ صاحب نے بخشی غلام محمد کا نام لئے بغیر صیغۂ جمع استعمال کیا ہے۔ جبکہ صیغۂ واحد کارکن بخشی غلام محمد تھا۔ اِس واقعہ کو دُہرانے کا مقصد یہ ہے کہ ایک شعلہ بار ماحول میں یہ بخشی غلام محمد کا دِل گردہ اور جراتمندی تھی کہ انہوں نے ایک گستاخ شخص کو اسلامی روایات کے مطابق پناہ دینے اور معاف کرنے کا انوکھا راستہ تلاش کیا۔

۸/اگست ۱۹۳۸ء کو مسلم کانفرنس نے ذمہ دار نظام حکومت ڈے منایا جس میں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو اور سکھ رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ ضلع میرپور کے صدر راجہ محمد اکبر خان نے اِس ضمن میں ایک پُرجوش تقریر کی۔ انہیں گرفتار کر کے ایک سال قید اور ایک سو روپے جرمانہ کا حکم سُنایا گیا۔ اِس پر احتجاجی جلسے اور جلوس نکلنے لگے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ہندو مسلم رہنماؤں کے دستخطوں سے ۲۷/اگست ۱۹۳۸ء کو قومی ڈیمانڈ نام کی ایک دستاویز مشتہر کی گئی۔ حکومت نے دستاویز پر دستخط کرنے والوں اور ان کے حامیوں کو گرفتار کر کے چھ چھ ماہ قید اور پچیس پچیس روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق اور مولانا محمد سعید مسعودی سے نیک چلنی ضمانت طلب کی گئی۔ ان کے انکار پر انہیں بھی چھ چھ ماہ قید کا حکم سنایا گیا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد مسلم کانفرنسی لیڈروں نے قومی سطح کی تنظیم قائم کرنے کیلئے غور

مسز اندرا گاندھی، پنڈت نہرو اور بخشی صاحب
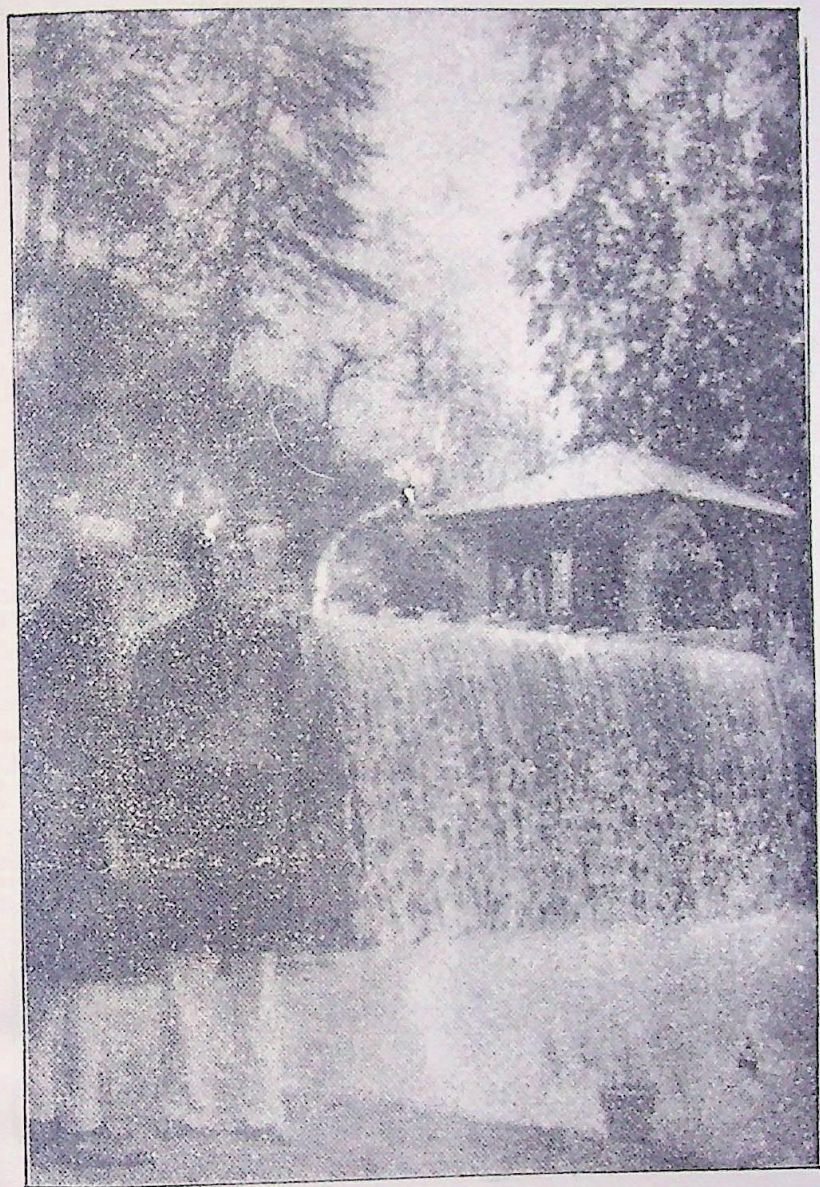
پنڈت نہرو کے ہمراہ شالیمار باغ میں

بخشی صاحب......غیر ملکی وفد کے ساتھ
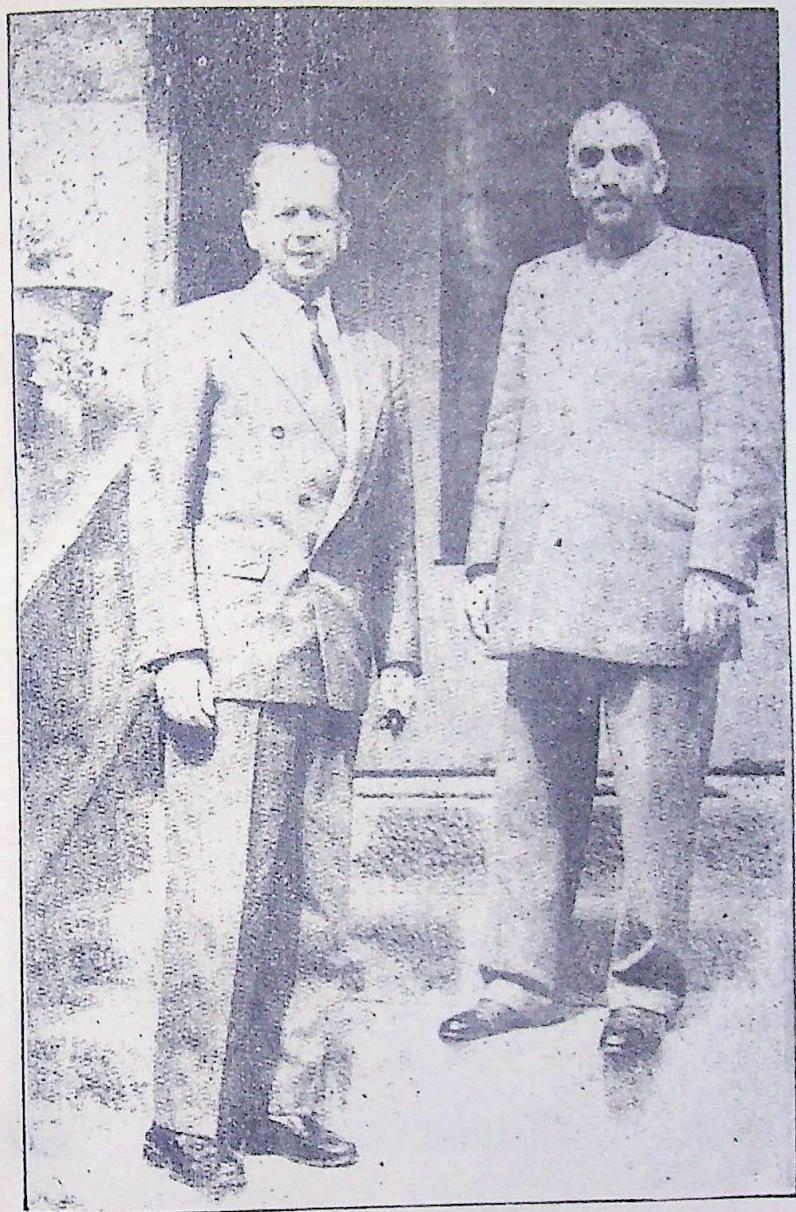
بخشی غلام محمد...... غیر ملکی سفارت کار کے ساتھ

شروع کیا اور بدلتے ہوئے نظریات وحالات کا جائزہ لینے کے لئے شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد، پریم ناتھ بزاز اور کشپ بندھو بمبئی یا کلکتہ کے دورے پر گئے تاکہ یہ معلوم کرسکیں کہ ریاست میں قومی سطح کی تنظیم قائم کرنے سے کون سے فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ اِن کی واپسی پر قومی سطح کی نئی انجمن تشکیل دینے کی خاطر باہمی صلاح مشورے شروع ہوگئے۔ مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں اِس تجویز پر جموں کے ممبران نے زبردست نکتہ چینی کی۔ ۱۰ر جون ۱۹۳۹ء کو سپیشل اجلاس میں مسلم کانفرنس کے نام اور آئین کو تبدیل کرنے کی تجویز کے حق میں چودھری غلام عباس خان نے تقریر کی اور پھر نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کی۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ تجویز کی مکمل حمایت کے باوجود کشمیری لیڈر کلی طور اِس سے متفق نہیں تھے بلکہ اِسے شیخ محمد عبداللہ کی من مانی کاروائی اور دباؤ کا ردِ عمل قرار دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اسلام آباد کے مسلم کانفرنسیوں نے سپیشل اجلاس کا نہ صرف بائیکاٹ کیا بلکہ مسلم کانفرنس کی سرگرمیاں تیز تر کیں۔ سرینگر میں پُرجوش نوجوان قریشی محمد یوسف کی قیادت میں منظّم ہوئے۔ اِس موقع پر بخشی غلام محمد نے اپنی حکمتِ عملی بروئے کار لاکر اُن سے خفیہ رابطہ قائم کیا اور انہیں یہ کہہ کر تھپکی دی کہ ''تم لوگوں نے بڑی جرائت، اور جوان مردی کا مظاہرہ کرکے مسلم کانفرنس کو زندہ رکھ کر شیخ محمد عبداللہ کے بدلتے ہوئے سیاسی نظریہ کا مقابلہ کیا ہے۔ گوکہ میری مجبوریاں مجھے نیشنل کانفرنس سے وابستہ کرچکی ہیں لیکن وہ دن دُور نہیں جب میں مسلم کانفرنس میں شامل ہوکر آپ کے دوش بدوش کام کروں گا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ مجاہد منزل کو، جو مسلم کانفرنس کی قیادت میں مسلمانوں کے عطیہ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ نیشنل کانفرنس

: وجوہات کا تفصیلی جائزہ چودھری غلام عباس خان نے اپنی سوانح حیات 'کشمکش' کے صفحہ ۲۱۲ تا ۲۱۶ پر پیش کیا ہے۔

اور شیخ محمد عبداللہ کے تصرف سے آزاد رکھا جائے۔ آپ کا فرض ہے کہ مجاہد منزل کو اپنے قبضہ میں لینے کیلئے عملی اقدام اُٹھائیں اور فی الحال اِس عمارت کے ایک حصہ پر مسلم کانفرنس کا بورڈ آویزان کر کے اس پر قبضہ کیا جائے''۔ؔ

اگلے دن محمد یوسف قریشی کی قیادت میں مُسلم نوجوانوں کی ایک ٹولی نے مجاہد منزل کے ایک حصّہ پر مسلم کانفرنس کا بورڈ چڑھا کر اپنا آفس کھولا۔ جب اِس واقعہ کا شیخ صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے بخشی غلام محمد کی قیادت میں پچاس والنٹیر وں کا ایک جتھا تحقیق و پاک وصاف کرنے کیلئے بھیجا۔ بخشی صاحب نے اپنے قول سے ہٹ کر نہ صرف بورڈ کو اُتار کر توڑا بلکہ ان لوگوں کی خاصی مرمّت بھی کی۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے مجھے اس واقعہ کی مزید تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ مسلم کانفرنسیوں سے عہد و پیمان باندھنے کے عمل میں بخشی صاحب اکیلئے نہیں تھے بلکہ خواجہ غلام محمد صادق بھی ان کے ساتھ تھے۔ اُن کی یہ میٹنگ بادام واری میں ہوئی تھی۔ جب بخشی صاحب غضبناک ہو کر مجاہد منزل پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف لشکر کشی میں مصروف تھے، میں مجاہد منزل میں موجود تھا اور میں نے محمد یوسف قریشی کو مزید مار کھانے سے بچایا۔ غرض بخشی صاحب نے جہاں ایک تیر سے دو شکار کئے وہاں ہر ایک کو اپنے قد کے مطابق تراش کے رکھا۔ چنانچہ 'آتش چنار' سے میں شیخ صاحب اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

> ''ایک طرف اگر مجھے چودھری غلام عباس خان، اللہ رکھا ساغر اور عبدالحمید قریشی کے تابڑ توڑ اعتراضات کا جواب دینا پڑتا تھا تو دوسری طرف مولانا محمد سعید مسعودی، بخشی

ؔ.....تاریخ حریت کشمیر جلد ا۔ص ۳۸۳۔۸۴

غلام محمد اور افضل بیگ کی ڈھلمل اور بعض حالات میں
وشواس گھات سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ مولوی عبداللہ
وکیل جیسے لوگ کھلم کھلا اس نظریئے کے دشمن تھے"

لیکن بخشی غلام محمد کی اَدائیں شیخ صاحب کو اس قدر بھائیں تھیں کہ بقول ان کے "میں نے ہمیشہ بخشی غلام محمد کی ان لغزشوں کو در گذر کیا"۔

کشمیر چھوڑ دو تحریک شروع ہونے سے چند دن قبل بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق جماعتی ہدایت کے تحت خفیہ طور لاہور چلے گئے اور جب اس ریاست گیر تحریک نے اپنے ارتعاش انگیز شباب سے مہذب دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا تو پنجاب کے مختلف علاقوں کا خصوصی طور دَورہ کر کے بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق نے جہاں ہندوستانی رائے عامہ کو بیدار کرنے کیلئے اہم رَول اَدا کیا وہاں ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں سے نہ صرف قریبی رابطہ قائم رکھا جس سے مجموعی طور پر برِ صغیر میں تحریک کی حمایت کی گئی۔ خصوصی طور پر دہلی، صوبہ سرحد اور پنجاب کے مسلم لیگی اخباروں نے کوئٹ کشمیر تحریک کی پرزور حمایت کی۔

بہر کیف ۱۵/۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کو جب ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوا تو پاکستان کے نام سے ایک نئی مملکت دنیا کے نقشے پر ابھر آئی، اسکے ساتھ ہی ریاست جموں و کشمیر کے مسئلہ الحاق کا پیچیدہ معاملہ سامنے آیا۔ یکم اگست ۱۹۴۷ء کو موہن داس کرم چند گاندھی نے سرینگر میں مہاراجہ ہری سنگھ سے ملاقات کی۔ ان کے واپس جاتے ہی وزیر اعظم رام چندر کاک کو وزارتِ اعظمیٰ سے برطرف کر کے جرنیل جنک سنگھ کو ریاست کا عارضی وزیر اعظم بنایا گیا اور اسیرانِ تحریک کوئٹ کشمیر غیر مشروط طور رہا ہوئے۔ بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق، کامریڈ چودھری محمد شفیع پر

ریاست میں داخلہ کی پابندی منسوخ ہوئی۔ بخشی صاحب کے اعزاز میں مائسمہ بازار سرینگر میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا گیا جس میں لوگوں نے 'باغی عبداللہ کی جے' کے نعرے لگائے۔ بخشی غلام محمد نے اس نعرے میں اصلاح کی خاطر کہا، 'جے' ہماری قومی زبان کا لفظ نہیں، زندہ باد کہو۔

۲۹ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو شیخ محمد عبداللہ بادامی باغ کنٹونمنٹ جیل سے رہا کئے گئے۔ گمان تھا کہ انہیں ریاست کا وزیر اعظم بنایا جائے گا لیکن مہاراجہ ہری سنگھ نے مہر چند مہاجن کو وزیر اعظم بنایا۔ ۲۳ر اگست ۱۹۴۷ کو پونچھ میں مہاراجہ ہری سنگھ کیخلاف بغاوت پھوٹ پڑی۔ شیخ صاحب کی رہائی کے ساتھ ہی ریاست میں جہاں سیاسی سرگرمیوں میں شدت پیدا ہوئی وہیں الحاق کے بارے میں قیاس آرائیاں اور سرگوشیاں تیز ہونے لگیں۔ پاکستان کے کئی سرکردہ حکام اور لیڈر سرینگر آئے اور گفت وشنید کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا۔ افواہوں کی گرم بازاری اور ۱۸ر اکتوبر ۱۹۴۷ کو نیشنل کانفرنس کے سرکردہ لیڈروں٭ اور ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے درمیان غلام قادر خان٭٭ کے مکان واقعہ خانقاہ سوختہ پر طویل محفلِ مذاکرہ منعقد ہوئی۔ اسے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے بجائے عام صلاح ومشورہ اور تبادلہ خیالات کی محفل کا نام دیا گیا۔

دہلی جانے سے قبل ۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۷ کو شیخ محمد عبداللہ نے لال چوک سرینگر میں ایک عوامی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے اور باتوں کے علاوہ کہا:

"تاریخ کے اس نازک ترین دور میں آپ لوگ فرد واحد کی طرح متحد ہوکر غیر مسلموں کے مال وجان کی حفاظت کریں۔ میں کل

٭ ماسوائے مرزا محمد افضل بیگ، جو اسلام آباد چلے گئے تھے

٭٭ بخشی غلام محمد کے ماموں جن کا تذکرہ 'آتش چنار' میں بھی کیا گیا ہے۔

دہلی جارہا ہوں آپ لوگ بخشی غلام محمد کی ہدایات پر عمل کریں"۔

۲۶ / اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قبائلیوں نے منظّم طور پر کشمیر پر حملہ کیا۔ مہاراجہ کی فوج حملے کی تاب نہ لاکر تیزی سے پیچھے ہٹنے لگی۔ میدانِ جنگ سے آنیوالی تشویش ناک خبروں سے مہاراجہ ہری سنگھ کے حوصلے پست کیئے اور وہ راتوں رات وادی سے فرار ہوگیئے۔ مہاراجہ کے بھاگ جانے کی خبر عام ہوتے ہی وادی میں طوائف الملوکی کا دَور دورَہ شروع ہوا۔ خوف وہراس اور سراسیمگی کے اِس عالم میں بخشی غلام محمد نے جرأت مندی کا مظاہرہ کرکے خانقاہ معلّیٰ کے صحنِ پاک میں عام لوگوں کو حالات حاضرہ سے باخبر کراتے کہا کہ ہمیں ہر قیمت پر فرقہ وارانہ اتحاد بحال رکھنا ہے اور اس کی عمل آوری کیلیئے مجھے دس ہزار والنٹیر وں کی فوری ضرورت ہے۔ آگے چل کر یہی رضا کار تنظیم سلامتی فوج کہلانے لگی۔ یہ بات شک وشُبہ سے بالاتر ہے کہ سلامتی فوج نے اپنے ابتدائی ایام میں بڑی خوش اسلوبی سے وادی کشمیر میں فرقہ وارانہ اتحاد کو قائم رکھنے میں مدد دی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اِس تنظیم سے تنومند افراد کو چُن کر کشمیر نیشنل ملیشیا قائم کی گئی جو ۱۹۵۴ء میں انڈین آرمی میں مدغم ہوکر اس کا حصہ بن گئی۔

۳۱ / اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک فرمان کے ذریعے شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کا ناظمِ اعلیٰ مقرر کرکے وزیر اعظم مہر چند مہاجن کے ساتھ منسلک کیا۔ بخشی غلام محمد نائب ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ انہیں جموں بھیجا گیا۔ انہوں نے وہاں اپنی سُوجھ بوجھ اور سیاسی تدبّر سے نہ صرف فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پایا بلکہ ہزاروں اغوا شدہ مسلم خواتین کو برآمد کرکے ان کے لواحقین کے پاس پاکستان بھیجنے کا بندوبست بھی کیا۔ ساتھ ہی ان ہتھیاروں کے بارے میں بھی تحقیقات کرانے کا اہتمام کرایا جو مرکزی حکومت نے قبائلی حملہ روکنے کیلیئے ریاستی حکومت کو بھیجے تھے

اور جنہیں فرقہ پرستوں میں تقسیم کرایا گیا تھا۔ اِس موضوع پر شیخ محمد عبداللہ اور مرکزی حکومت کے مابین طویل خط وکتابت کے بعد مہاراجہ کی وساطت سے ہتھیار درآمد کرنے کا سلسلہ منقطع ہوا۔

۵/مارچ ۱۹۴۸ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک اور فرمان کے ذریعہ مہر چند مہاجن کو ریاستی وزارت اعظمٰی کے عہدے سے برطرف کر کے شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کا نیا وزیراعظم نامزد کیا۔ بخشی غلام محمد نئی وزارت میں نائبِ وزیراعظم بنائے گئے اور انہیں وزارتِ داخلہ کا قلمدان سونپا گیا۔ ریاست میں نیشنل کانفرنس کو بحیثیت واحد سیاسی جماعت کے اُبھارنے میں انُہوں نے کلیدی رول اَدا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ صوبہ جموں میں وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے لیکن وہاں نیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ضرور ہوئے جس کی بناء پر وہ نہ صرف داد تحسین کے مستحق قرار پائے بلکہ مردِ آہن بھی کہلانے لگے۔

اس زمانے میں خواجہ غلام محی الدین قرہ نیشنل کانفرنس کے صوبائی صدر تھے۔ انہوں نے نیشنل کانفرنس کے صوبائی اجلاسوں میں بخشی غلام محمد کے طور طریقوں پر شدید نکتہ چینی شروع کی جس سے یہ اندازہ ہونے لگا کہ اس جماعت کے اندر بھی اختلافات پل رہے ہیں اور جماعت باہمی کشیدگی سے خالی نہیں ہے لیکن جماعت کے قائد جناب شیخ محمد عبداللہ جنہیں بخشی غلام محمد کی ہر ادا مرغوب اور دل نواز لگتی تھی ...... نے غلام محی الدین قرہ کی بڑھتی ہوئی نکتہ چینی کا جواب دینے کیلئے نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری مولانا محمد سعید مسعودی کو مجاہد منزل میں منعقدہ ایک ایسی ہی میٹنگ میں بھیجا جس میں بخشی اور قرہ دونوں موجود تھے۔ انہوں نے کہا:

"یہ اختلافات کہیں ناسمجھی، کہیں غلط فہمی اور کہیں خود غرضیوں کے نتائج ہیں۔ تمام مخلص اور دانشور کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ان میں نہ اُلجھیں اور اِن بحثوں سے دُور رہ کر اپنا فرض انجام دیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شکایات کی تحقیقات کرنا اور مجلس آرائی کا طریقہ تخریبی ہے، اِس کو ترک کرو۔"

خواجہ غلام محی الدین قرہ نے نوشتہَ دیوار پڑھا۔ اِن کی علیحدگی سے نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں پہلی دراڑ پڑی مگر یہ تنظیمیں سطح پر بخشی غلام محمد کی ایسی فتح تھی جس نے انہیں تنظیمیں اور سرکاری احکامات پر حاوی ہونے کی قوت بخشی۔

فروری ۱۹۴۹ء میں صوبہ جموں میں پرجا پریشد نے شیخ وزارت کیخلاف ایجی ٹیشن شروع کی۔ گو اسے دبانے میں حکومت کو بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ بخشی غلام محمد نے اِسے جمنے نہیں دیا۔ بالآخر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پرجا پریشد کے رہنماؤں نے غیر مشروط طور پر یہ تحریک واپس لے لی اور اس عمل کو بخشی غلام محمد کا حسنِ تدبّر قرار دیا گیا۔

اِسی دَوران سردار ولبھ بھائی پٹیل مرکزی وزیرِ داخلہ نے پارلیمنٹ میں کشمیر کی اِقتصادی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"حکومتِ ہند نے ۴۷۔۱۹۴۸ء میں حکومتِ کشمیر کو دو کروڑ رُوپے کا قرضہ دیا ہے اور سال ۱۹۴۹ء کیلئے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کا قرضہ فراہم کر رہی ہے۔ اِسکے علاوہ حکومتِ ہند، کشمیر میں جو کچھ خرچ کر رہی ہے وہ قرضہ ہی ہے جو پانچ سال تک واجب الادا ہے"۔

اِس بیان کے جواب میں بخشی غلام محمد نے ریاست کی معاشی اور اقتصادی بدحالی کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اس کے سدباب کیلئے اعلان کیا کہ سرکاری اخراجات کو اعتدال پر لانے کیلئے لازم ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کی ذات، مہارانی اور شاہی خاندان کی ٹھاٹھ باٹھ کو قائم رکھنے کیلئے ریاست سے ہونیوالے خرچے کی تمام مدّوں کو ختم کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ ریاستی حکومت نے وزیرِ داخلہ کی سفارش پر مہاراجہ اور مہارانی کی ذات پر ریاستی مدّوں سے خرچ ہونے والی دس لاکھ روپے کی سالانہ رقم، پولو گراؤنڈ پر سالانہ بیس لاکھ روپے اور ریاستی گیسٹ ہاؤس پر بے پناہ دولت لُٹانے کے سابق احکامات کو کالعدم و منسوخ کرنے کا حکم جاری کیا۔

۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس نے غیر حاضر زمینداری کا خاتمہ اور زرعی زمین کسانوں کی ملکیت قرار دینے کا اصول تسلیم کیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں ریاستی حکومت نے اِسی اصول کے تحت زرعی اصلاحات نافذ کرنے کیلئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مرزا محمد افضل بیگ اور ڈی پی دھر اس بات کے حق میں تھے کہ غیر حاضر زمینداروں کی تحویل میں ایک ہزار کنال زمین رکھنے کے بعد جو باقی رہے گی، وہ کاشتکاروں میں مفت تقسیم کی جائے جبکہ مولنٰا محمد سعید مسعودی اور بخشی غلام محمد نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں ماسٹر روشن لال کے ذریعہ قرارداد پیش کرائی کہ زمینداروں کے پاس صرف ۱۶۰ کنال تک زمین رکھی جائے۔ قرارداد معمولی سی ترمیم کے بعد پاس ہوئی لیکن لفظ بلا معاوضہ کے مدعا و مقصد پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان اِختلافات نے سنگین صورت اختیار کی۔ ۱۹۵۰ کے اوائل میں اِس مسئلہ کو سلجھانے کیلئے شیخ محمد عبداللہ اپنی ساری کابینہ کو لے کر دہلی گئے جہاں

وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے کہ ریاست میں رائے شماری کے موقعہ پر یہ عمل ہمارے لئے ثمر آور ثابت ہوگا۔ اس پر مرکزی حکومت کی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے سردار پٹیل نے پارلیمنٹ میں اِس موضوع پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا:

''بڑی زمینداریاں ختم کرنا ریاست کا اندرونی معاملہ ہے مرکز اِس میں مداخلت نہیں کرسکتا ہے''۔

یوں مسئلہ باہمی گفت وشنید اور سمجھ داری [ن] سے طے ہوا۔

دہلی سے بخشی غلام محمد اپنے کسی نجی کام سے اور خواجہ غلام محمد صادق گردے کا آپریشن کرانے کیلئے ممبئی چلے گئے۔ دونوں نے ایک ہی ہوٹل میں قیام کیا۔ ایک رات بخشی غلام محمد صادق صاحب کے کمرے میں آئے اور ترنگ میں آکر باتوں باتوں میں کہا: 'صادق تم میرا ساتھ دو میں نے اس کا دہلی میں پتہ کاٹ لیا ہے، میں اُسے چھٹی کا دودھ یاد دِلا دوں گا'۔ اگلے دن سویرے بخشی صاحب کو یہ احساس ستانے لگا کہ کہیں غلام محمد صادق راز فاش نہ کردے اُنہوں نے صادق صاحب کو ایک اسلوبِ لفاظیت کے مختلف زاویوں سے کریدنا شروع کیا۔ صادق صاحب بھانپ گئے، اُنہوں نے اپنی بات چیت میں بخشی صاحب کے مُنہ سے نکلے صدر جملے کی جانب ہلکا سا اِشارہ بھی نہیں کیا۔ بخشی صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور اسے اپنا وہم خیال کرکے بھول گئے۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق کے درمیان ٹھن گئی۔ صادق صاحب نے بخشی غلام کو نیچا دکھانے کی خاطر صدر واقعہ شیخ صاحب کی نوٹس میں لایا اور جب شیخ صاحب نے انہیں بخشی صاحب کے سامنے

ن ...۱۳ر جولائی ۱۹۵۰ء صبح ۹ ربجے لال چوک سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی پولیس اور ملیشیا کے جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ریاست میں زرعی اصلاحات نافذ ہونے کا اعلان کیا اور اسی شام کو مزار شہداء پر اپنی تقریر میں اس کی تفصیلات بیان کیں۔

اِسے دُہرانے کو کہا تو بقولِ شیخ محمد عبداللہ، غلام محمد صادق مکر گئے۔ اِس پر شیخ صاحب سخت ناراض ہوئے۔ صادق صاحب کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد ازاں بخشی غلام محمد کی سفارش اور حمایت سے ہی غلام محمد صادق ریاستی مجلسِ آئین سازیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اِس طرح بخشی غلام محمد نے اپنی سیاسی بساط اور شیخ محمد عبداللہ پر اپنی گرفت کا لوہا غلام محمد صادق سے منوایا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فرقہ وارانہ تعصب اور فسادات نے ہندوستان کے خاور و باختر کو متاثر کیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کیلئے یہ ماحول تشویش اور فکر مندی کا باعث بنا۔ انہیں یہ کھٹکا ستانے لگا کہ اگر اِن حالات میں ریاستی جموں و کشمیر میں رائے شماری کی گئی تو ریاست میں ہند مخالف قوّتیں اِسے اپنا سیاسی سرمایہ بنا کر اُن کے تیس سالہ سیاسی نظریہ کو بھسم کر کے چھوڑ دیں گے۔ اِس اندیشہ کی روک تھام کیلئے انہوں نے دہلی کے اعلیٰ ایوانوں میں آواز اُٹھائی جہاں اُن کی بات سنجیدگی سے سنی گئی لیکن سردار پٹیل نے اسے آگے بڑھنے سے روکا۔ دراصل شیخ محمد عبداللہ کے بڑھ چڑھ کر بولنے کی عادت سے سردار پٹیل خار کھائے بیٹھے تھے اور انہیں یہ بھی گمان تھا کہ ریاست جموں و کشمیر کا الحاق مہاراجہ ہری سنگھ کے احساس اور ان کے فہم و فراست کا نتیجہ ہے اور شیخ محمد عبداللہ کو پنڈت جواہر لال نہرو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ اِن حالات سے مایوس ہو کر شیخ محمد عبداللہ نے مرکزی لیڈروں کے ضمیر کو بیدار کرنے کیلئے اپنی دلی کیفیت کو عوامی سطح پر اُبھارنے کا طریقہ اختیار کیا تو سردار پٹیل نے اِسے چیلنج سمجھ کر نہ صرف جموں کی پرجا پریشد کی پشت پناہی شروع کی بلکہ ریاست میں متوازی لیڈر شپ قائم کرنے کیلئے بخشی غلام محمد کی پشت پناہی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ حتیٰ کہ پارلیمنٹ میں وزیراعظم ہند کو متعصب

ممبران کے ذریعہ ہراساں کرنے اور کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی حمایت روکنے کیلئے اُن پر دباؤ ڈالنے سے بھی باز نہ آئے جس کے نتیجہ میں وزیراعظم ہند نے وزیراعظم کشمیر کے نام خطوط کی کاپیاں ریاست کے وزیر داخلہ کو بھیجنے سے ابتداء کی۔ شیخ محمد عبداللہ نے اِس پر احتجاج کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو لکھا:

"یہ طریقہ غلط ہے اگر آپ ریاست میں بخشی غلام محمد کو وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں تو شوق سے بنایئے لیکن اوُچھے ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیجئے"۔

دِلوں کی رنجشیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

چنانچہ بَداعتمادی کی فضا اور اِن رنجشوں کو دُور کرنے کیلئے جولائی ۱۹۵۲ء میں مرکز اور ریاستی حکومت کے مابین ریاستی اُمور کے متعلق تعلّقات و اختیارات کی حد بندی کیلئے ایک خصوصی میٹنگ دہلی میں منعقد ہوئی جس میں بعض اُمور پر اختلافِ رائے نے سنگین صورت اختیار کی جس کے باعث ریاستی نمائندے شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ تفصیلات طے کئے بغیر ہی کشمیر واپس آنے کیلئے دہلی ریلوے سٹیشن پر پہنچے۔ اِس نازک موقعہ پر بخشی غلام محمد کی سعیٔ کامیاب نے تعطّل کو ختم کرنے کیلئے ریاستی نمائندوں کو واپس گفت وشنید کی میز تک پہنچایا۔

۱۴؍جولائی ۱۹۵۲ء کو دہلی ایگریمنٹ عالمِ وجود میں آیا۔ لیکن حالات گواہ ہیں کہ معاہدے سے دونوں فریق مطمئن نہیں تھے۔ ایگریمنٹ میں طے شدہ اُمور سے متعلق الفاظ معنی اور تشریحات کی فریقین نے اَپنے اَپنے ڈھنگ اور مقصد سے تعبیریں نکالنی شروع کیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے کُھلم کُھلا مرکز پر عہد شکنی کا الزام عائد کرتے ہوئے ریاستی مسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ کے حق میں تقاریر اور بیانات

جاری کرنے کا عمل تیز تر کیا۔ اِس ڈرامے کا آخری سین ۹ راگست ۱۹۵۳ء کی صبح کو شیخ محمد عبداللہ کو وزیراعظم کے عہدے سے برطرف اور گرفتار کر کے ڈراپ ہوا۔ صوبہ جموں میں پرجا پریشد نے تحریک واپس لی اور وادی کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس تحریک کے دوران ۳۳ جانیں تلف ہوئیں۔

۹ راگست کی رات کے سوا آٹھ بجے بخشی غلام محمد نے ریڈیو کشمیر سے اپنی نشری تقریر میں کئی مراعات کا اعلان کرتے ہوئے کہا:

> ''آج کا دن کشمیر کی سیاسی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جو فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں وہ ہماری قوم کی تاریخ اور مستقبل پر اثر انداز ہوگا۔ آپ اِس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ گزشتہ چند ماہ سے ہماری ریاست ایک شدید سیاسی اور معاشی بحران کا شکار بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے ریاست کی وحدت اور یہاں کے عوام کا اتحاد خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اِس قومی خطرے کو دُور کرنے کی اہم ضرورت کے پیشِ نظر میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنے فرائض کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا ہے''۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّمہ ہے کہ بخشی غلام محمد اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان نظریاتی اختلافات ۹ راگست سے قبل ہی منظرِ عام پر آچکے تھے لیکن بخشی غلام محمد وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھ کر انہیں چھپاتے رہے۔ حالانکہ ۴ راگست کو مجاہد منزل میں نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے اِن افواہوں کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ عام مسلمانوں کیلئے پانچ ارکان اسلام پر ایمان لانا لازمی

ہے لیکن میرے لئے شیخ محمد عبداللہ کی وفاداری چھٹے رُکن کا درجہ رکھتی ہے۔

اِقتدار سنبھالنے سے پہلے بخشی صاحب نے یہ شرط عائد کی تھی کہ شیخ محمد عبداللہ کے آزاد رہنے کی صورت میں وہ کاروبارِ حکومت نہیں چلا سکتے ہیں چنانچہ نئی وزارت کا حلف لینے سے قبل انہیں شیخ صاحب کی وارنٹ گرفتاری کی نقل فراہم کی گئی۔ بقول اجیت پرشاد جین اور ڈاکٹر کرن سنگھ، شروع میں بخشی صاحب کچھ ڈھلمل سے رہے لیکن بعد میں انہوں نے پوری قوّت سے اقتدار کا استعمال کیا۔

۹ راگست ۱۹۵۳ء کی تحریک کو دَبانے میں بخشی صاحب کو زیادہ دِقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انہوں نے سیاسی وضعداری کی خاطر وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے تقریباً جملہ ممبران اسمبلی کو حفاظت خودی کے نام پر حراست میں لیا اور ان میں سے بیشتر ممبران کی وَفاداریاں خرید کر ریاستی اسمبلی میں اپنی اکثریت کا اعلان کیا۔

شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد انہیں نیشنل کانفرنس کی صدارت سے الگ کرنا بخشی صاحب کیلئے لازمی تھا۔ انہوں نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ مولانا مسعودی جنرل سیکرٹری وممبر پارلیمنٹ اجلاس میں شرکت کرنے کیلئے دہلی سے سرینگر آئے۔ راستے میں انہیں شری ڈی پی دھر کی ہدایت پر بَس سے نیچے اُتارا گیا۔ اِس ناشائستگی پر مولانا محمد سعید مسعودی نے رام بن میں نائب تحصیلدار کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ اِس طرح مولانا کے سرینگر پہنچنے سے قبل ہی ورکنگ کمیٹی نے حسب منشاء اپنا فیصلے لے لیا۔ مولانا نے خانقاہ معلّٰی کے صحن میں لوگوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے شیخ صاحب کی گرفتاری پر اظہارِ افسوس کیا۔ بخشی غلام محمد نے مولانا پر ڈورے ڈالنے کی غرض سے خفیہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ بقول مولانا 'میں اِن حالات میں گرفتار ہونا نہیں چاہتا

تھا، اس لئے شرط رکھی کہ صوفی محمد اکبر ممبر پارلیمنٹ کو رہا کر کے اس ملاقات میں شامل کیا جائے۔ ملاقات کیلئے پہلے کُد ڈاک بنگلہ اور بعد میں جموں سرکٹ ہاؤس طے پایا۔ ملاقات کے بعد تینوں دہلی چلے گئے۔ بخشی صاحب کو یقین تھا کہ اب پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے مولانا ان کی تشدّد آمیز کاروائیوں کی وکالت کریں گے لیکن جب مولانا نے بے گناہ لوگوں کے مَرنے کے محلّہ وار اعداد و شمار پیش کئے تو بخشی صاحب نے ۳۳ / افراد کے مارے جانے کا اِقرار کیا جبکہ مولانا تین ہزار بے گناہوں کے قتل ہونے کی دلیل پر بضد رہے۔

پیار، محبت، راحت اور قائدانہ رہنمائی کے بجائے بخشی غلام محمد نے نہ جانے کیوں کہ صوبۂ کشمیر میں دیدہ و دانستہ زور زبردستی کے حربوں کو استعمال کرنے کی اِجازت دی۔ اُن کے گِرد طالع آزماؤں اور سیاسی یتیموں کے ایک بڑے گروہ نے ڈیرہ ڈالا اور وہ اِس حصار سے باہر نہ آسکے۔ چنانچہ تحریر و تقریر کی آزادی پر پابندیاں عائد کیں گئیں۔ اخبارات کو سانپوں سے تشبیہ دی گئی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سانپ کو سدھایا جائے یا مارا جائے؟ بخشی صاحب کے دَورِ انتظامیہ میں اخبار کا ڈیکلریشن حاصل کرنا اگرچہ جُوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن اکثر نامی گرامی اخبار نویس اُن کے وظیفہ خوار تھے۔ کئی نامہ نگاروں پر بخشی صاحب بے حد مہربان تھے۔ بخشی صاحب کے دَورِ اقتدار میں سپیشل سٹاف (خفیہ پولیس ایجنسی) کی سیاسی غنڈہ گردی عروج کو پہنچی۔ بخشی صاحب کی ذات کو ان کے حامیوں نے سُپر بنا کر اِسے داغدار بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن اِس کے باوجود بخشی صاحب نے بحیثیت ایک ایڈمنسٹریٹر کے مجموعی طور پر ریاست جموں و کشمیر کی تعمیر و ترقی میں حیرت انگیز اور قابلِ تحسین کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے اُپنے دَورِ اقتدار میں تعلیم کو فروغ

دینے کی خاطر پرائمری کلاس سے لے کر ایم اے تک مُفت تعلیم کو رائج کیا۔ ہزاروں بیروزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سرکاری ملازمت سے منسلک کرنے میں نہ صرف پہل کی بلکہ ملک کے مختلف میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں داخلہ دِلا کر اُن کی مالت حالت سُدھارنے کے ساتھ ساتھ ریاستی ضرورتوں کو پُورا کیا۔ جموں اور سرینگر میں سنٹرل سیکرٹریٹ کی نئی اور شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ریاست کے دونوں دارالحکومتوں میں سڑکوں کو کشادہ اور گلی کوچوں کو پختہ کرنے پر توجہ دی۔ ریاست میں سینکڑوں میل لمبی کچّی اور پکّی سڑکیں تعمیر کرائیں۔ پُل بنوائے اور آبپاشی کیلئے نہروں کا جال بچھوایا۔ ریاست میں پہلی بار میڈیکل کالج اور ریجنل انجینئرنگ کالج کی بنیاد رکھی۔ ٹورسٹ ری سپشن سنٹر، کھیلوں کے اسٹیڈیم اور ٹیگور ہال تعمیر کرائے۔ ریاست میں زبانوں، آرٹ اور ثقافت سے متعلق اکیڈیمی (کلچرل اکیڈیمی) قائم کی۔ ریاست میں کھیلوں کو بڑھاوا دینے کیلئے فلم سٹاروں کے کرکٹ میچ کرائے۔ جشن کشمیر کے نام سے ثقافتی وتمدنی سرگرمیوں کا اہتمام کیا۔ اِسلامیہ ہائی سکول سرینگر کی عمارت' جو آگ کے حادثہ میں جل کر خاکستر ہوئی تھی کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ جموں اور سرینگر میں ایم ایل اے ہوسٹل، جگہ جگہ پنچایت گھروں کی تعمیر، جموں شہر میں تالاب کھٹیکاں کی جامع مسجد، چرارِ شریف میں حضرت نورالدین نورانیؒ کی خانقاہ کے احاطہ کی وسعت اور اوقافِ اسلامیہ کے انتظام وانصرام اُن کے یادگاری کارناموں کی لازوال مثالیں ہیں۔

بخشی صاحب کا ریاستی وزیراعظم کے عہدے سے مستعفی ہونے کا معاملہ کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اگست ۱۹۶۳ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کامراج پلان کے تحت کانگریسی وزراء کے استعفے طلب کئے۔ بخشی غلام محمد نے وزیراعظم ہند کے

مہتمم خصوصی کی حیثیت میں ان استعفوں کی عمل آوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جوش واعتماد کی اِس فضا میں بخشی صاحب نے بھی مستعفی ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ اِس پر پنڈت جی نے ان سے کہا کہ آپ کانگریس کے ممبر نہیں ہیں۔ بخشی صاحب نے جیب سے چوّنی (چار آنے یا ۲۵ پیسے کا سکہ) نِکال کر کانگریس کی ممبر شپ حاصل کی۔ حالانکہ نیشنل کانفرنس کے آئین کے تحت اِس جماعت کا کوئی ممبر بیک وقت کسی دوسری جماعت کا ممبر نہیں ہوسکتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نے کامراج، مرار جی ڈیسائی، پرتاپ سنگھ کیروں، جگ جیون رام، چندر بھان گپتا، لال بہادر شاستری سمیت بخشی غلام محمد کا استعفیٰ بھی منظور کر کے انہیں اقتدار سے الگ کیا۔ بخشی صاحب کو اُپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ نئی دہلی میں تین مورتی ہاؤس کے سامنے اور سرینگر کے بازاروں میں اُن کے حامیوں نے 'پنڈت جی پھر سوچو اور استعفیٰ واپس لو' کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ لیکن نہ پنڈت جی نے پھر سوچا اور نہ بخشی صاحب کا استعفیٰ ہی مُسترد ہوا۔ رَدِعمل کے طور پر بخشی صاحب کی خواہش اور ہدایت پر نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی نے خواجہ شمس الدین کو ریاستی وزیر اعظم کے عہدے کیلئے منتخب کیا لیکن وہ اِس عہدے پر برائے نام ہی تھے، اصل طاقت بخشی صاحب کے ہاتھ میں ہی رہی۔

۲۷ر دسمبر ۱۹۶۳ء کی شب کو آثارِ شریف حضرت بل سے موئے مقدس رسول مقبول ﷺ کی گمشدگی کے سانحہ سے وادی کے لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ خواجہ شمس الدین کو بڑی لاچاری کے عالم میں وزارتِ اعظمیٰ کے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ فروری ۱۹۶۴ء کو جموں میں لال بہادر شاستری کی قیادت میں بخشی صاحب کی قیام گاہ پر نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں بخشی صاحب کی تجویز

پر خواجہ غلام محمد صادق نئے ریاستی وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ صادق صاحب نے اپنی پالیسی بیان میں فوری طور کئی اصلاحات نافذ کرنے کا اعلان کیا جن میں تحریر و تقریر پر عائد شدہ پابندیوں کو ہٹانا شامل تھا۔ ۸؍اپریل ۱۹۶۴ء کو کشمیر سازش کیس اور حضرت بل قتل کیس جیسے مقدمے واپس لینے کا اعلان ہوا۔

اِن واقعات سے ریاست میں خوشگوار حالات پیدا ہونے میں مدد ملی لیکن عوامی حلقوں میں بخشی صاحب کیخلاف جذبات کم نہ ہوئے۔ اِس بارے میں بخشی صاحب کی قطعی رائے یہ تھی کہ اس کے پسِ منظر میں صادق صاحب تار ہلا رہے ہیں۔ ۲۷؍مئی ۱۹۶۴ء کو وزیرِ اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو انتقال کر گئے۔ اُن کی وفات سے قبل ہی بخشی صاحب اور صادق صاحب کے درمیان رسہ کشی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ بخشی صاحب نے ممبران اسمبلی کی اکثریت کو اپنا ہم نوا بنا کر صادق حکومت کو اسمبلی سیشن میں عدمِ اعتماد سے گرانے کا پکا ارادہ کیا جس کا علم صادق صاحب کو اسمبلی سیشن کے پہلے ہی دِن ہوا۔ اِس حادثہ سے بچنے کیلئے صادق صاحب نے گورنر شری بھگوان سہائے کی مدد سے مرکزی حکومت کو اِس امر پر راضی کر لیا کہ اس نے بخشی غلام محمد کو گرفتار کرنے کی اجازت دی جائے۔ مرکزی حکومت کی رضامندی سے اِسی شب انہیں حراست میں لے کر اُدھم پور کے تارانواس جیل میں نظر بند کیا گیا اور اُن کے دوسرے ساتھی بھی گرفتار کئے گئے۔ اُسی صبح کو ایک اعلان کے ذریعہ کشمیر اسمبلی کا سیشن برخاست کر دیا گیا۔ صادق صاحب نے بھی ممبران اسمبلی کی وفاداریاں خریدنے کیلئے اپنے رفقاء کو مامور کیا۔ تارانِواس میں بخشی صاحب کو دِل کا عارضہ لاحق ہوا۔ تین ماہ بعد ڈاکٹروں کی ہدایت اور مشورے پر وہ رہا کئے گئے۔

بخشی صاحب کو سیاسی سرگرمیوں سے دُور رکھنے اور ذہنی طور اُلجھانے کیلئے صادق انتظامیہ نے بخشی صاحب اور انکی حکومت میں مبینہ بدعنوانیوں کے بارے میں تحقیقات کرنے کیلئے آئینگر کمیشن کی تقرّری کا اعلان کیا۔ کمیشن نے چھ ماہ کی مسلسل چھان بین کے بعد ایک ہزار صفحات پر مشتمل اُپنی رپورٹ میں بخشی خاندان کے جُملہ اُفراد کی جائیداد کی تفصیل و تخمینہ پیش کیا لیکن جب اِس کے حاصل جمع پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ماسوائے اِس کے میزان میں بخشی صاحب کو ریاستی اسمبلی کی کسی بھی نشست سے بحیثیت امیدوار کھڑا ہونے سے روکنے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کمیشن کی تقرری کا غالباً صادق صاحب کا مدعا و مقصد بھی یہی تھا۔ کمیشن کو اُن تمام حکام کی امداد حاصل رہی جو کبھی بخشی غلام محمد کے دست و باز و کہلاتے تھے۔

آگ دی صیاد نے جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہُوا دینے لگے

خواجہ غلام محمد صادق کا مقابلہ کرنے کیلئے ۱۹۶۶ء میں بخشی صاحب نے بقول اکبر الٰہ آبادی۔

کھینچو نہ کمانوں کو، نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اُخبار نکالو

اِس منظوم فارمولے کو آزمانے کیلئے روزنامہ ”نوائے کشمیر“ سرینگر سے جاری کیا۔ اُخبار کی اِدارت وَقفہ وَقفہ سے غلام محمد ڈار، صوفی غلام محمد اور بدری ناتھ مٹو نے سنبھالی۔ اخبار میں صادق انتظامیہ پر کڑی نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ صادق صاحب پر بھی حملے کئے جاتے تھے جنہیں صادق صاحب نہایت ہی متانت اور صبر و ضبط سے برداشت کرتے رہے۔ کشمیری پنڈت ”پرمیشوری“ ایجی ٹیشن کے دَوران ریاستی حکومت نے سرینگر کے جن اخباروں کی اشاعت پر تین تین ماہ کی پابندی عائد کی

نوائے کشمیر اِن میں شامل تھا۔ پابندی کے اختتام پر اخبار دُوبارہ شائع نہیں ہوا۔

اکتوبر ۱۹۶۸ء میں شیخ محمد عبداللہ نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے مختلف الخیال اَفراد اور جماعتوں کے نظریوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے پیپلز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ بخشی غلام محمد نے مجاہد منزل میں کانفرنس کی منعقدہ میٹنگوں میں پابندی سے شرکت کی اور بَرملا اَپنے نکتہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ہندوستان سے ریاست کے الحاق کی حمایت کی۔

فروری ۱۹۷۱ء میں وَسط المدتی پارلیمانی انتخابات میں بخشی غلام محمد کانگریس کے اُمیدوار کی حیثیت میں سرینگر کی نشست سے کھڑے ہوئے۔ اُن کے مقابلے کیلئے محاذ رائے شماری کی تنظیم نے شمیم احمد شمیم کو جو پہلے اننت ناگ سے کھڑے ہوئے تھے، کھڑا کیا اور ان کی حمایت میں بیگم شیخ محمد عبداللہ، مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ جیسے کہنہ مشق سیاستدان میدان میں آئے۔ اِس معرکہ میں جہاں وزیراعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق کی دَرپردہ حمایت شمیم احمد شمیم کو حاصل تھی وہاں پردیش کانگریس کے صدر سیّد میر قاسم نے دِل کھول کر بخشی غلام محمد کا ساتھ دیا۔ اِسی طرح .... نے حجاب در حجاب اپنے حامیوں کو بخشی غلام محمد کو کامیاب کرنے کی ہدایت دی۔ انتخابی جلسے جلوس اور ہنگامے اپنے شباب پر تھے۔ ایسے ہی ایک انتخابی جلسے میں جو مہاراج گنج میں بخشی صاحب کے حامیوں نے منعقد کیا، بخشی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"آج جو لوگ میرے خلاف صف آراء ہوئے ہیں اور مجھے ہندوستانی نظریہ کا نقیب کہہ کر طعنہ دے رہے ہیں، میرے بعد وہی لوگ ہندوستان کے حق میں سَربہ کف ہو کر آپ

کے سامنے آئیں گے لیکن تب میں نہ ہوں گا۔"

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ موئے مقدس کے سانحہ کے بعد جب کبھی بھی بخشی غلام محمد نے سیاسی سرگرمیاں شروع کیں اُن کے مخالفین "اصلی ملزم کو پیش کرو" کا نعرہ لگا کر یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ موئے مقدس پر دستِ خیانت دراز کرنے میں بخشی صاحب کا ہاتھ ہے۔ مہاراج گنج کے اِسی جلسہ میں بخشی غلام محمد نے واضح الفاظ میں یہی الزام مولانا محمد سعید مسعودی، مرزا محمد افضل بیگ اور خواجہ غلام محی الدین قرہ پر عائد کیا۔ میری یادداشت کے مطابق اِس واقعہ کے بعد اس نعرے کے پہلے والے معنی بدل گئے اور یہ نعرہ اِن معنوں میں نہیں دیا جانے لگا جن سے بخشی صاحب کی تضحیک کا پہلو نمایاں ہوتا۔ انتخابات میں بخشی صاحب نے اُپنی ہار کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کیا۔ انہیں کشمیری عوام کے اِس فیصلہ کا کوئی ملال نہ تھا۔

عارضۂ قلب نے بخشی صاحب کی سیاسی سرگرمیاں محدود کیں۔ بالآخر ۱۵؍جولائی ۱۹۷۲ء کی صبح ۱۱ بجے فولادی عزم و استقلال کے حامل اِس سیاستدان نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اِسی دن شام تین بجے اُنکی نمازِ جنازہ پولو گراؤنڈ سرینگر میں بیس ہزار کے قریب فرزندانِ توحید نے اَدا کی۔ نمازِ جنازہ میں اگر کسی نے شرکت نہیں کی تو وہ شیخ محمد عبداللہ کی ذات تھی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی اِس اجتماع میں شامل ہوئے۔ اُن کے جنازے کا جلوس ڈل گیٹ، خانیار، نائید کدل، کلاش پورہ سے ہوتے ہوئے اُن کے آبائی مقبرہ خانقاہ معلیٰ پہنچایا گیا۔ خانقاہ معلیٰ کے مدِمقابل دریائے جہلم کے دوسرے کنارے پر کچھ لوگوں نے اُن کی وفات پر آتش بازی اور پٹاخے سَر کئے۔ غالباً یہ وہ لوگ تھے جنہیں بخشی صاحب کے دَورِ اقتدار میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اِسی دَوران میں نے لگ بھگ اٹھارہ سالہ

ایک لڑکے کو خانقاہ معلیٰ کی ڈیوڑھی کے سامنے والے چبوترے پر بخشی غلام محمد کے متعلق ناشائستہ الفاظ کہتے سنا۔ ڈیوٹی پر تعینات سی آئی ڈی انسپکٹر محمد شعبان میر نے مجھے بتایا کہ اِس لڑکے کی ماں مسماۃ سارہ بیگم نے ۹/اگست ۱۹۵۳ء کو پولیس کی گولی سے اِسی صحن میں دم توڑنے سے قبل اس لڑکے کو اِسی صحن میں جنم دیا تھا۔

بخشی غلام محمد کی اِن تمام خوبیوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو بات انہیں ریاست جموں وکشمیر کے جملہ سیاسی رہنماؤں میں منفرد، ممتاز اور یکتا بناتی ہے وہ ان کا دستِ سخاوت ہے۔ ریاستی سیاست میں داخل ہونے کے ابتدائی ایّام میں جبکہ ان کا شمار بھی غرباء میں ہوتا تھا، اپنے سے کم تر سیاسی ورکروں کے قلمے سخنے اور درِمے مدد کرتے تھے۔ انہیں کسی کے کام آکے یا مدد کر کے خوشی ہوتی تھی۔ اپنے دورِ حکومت میں انہوں نے رہائش گاہ پر لنگر کھول رکھا تھا۔ اُن کی وفات پر اُن کے مکان سے تقریباً تین سو راشن کارڈ اُن لوگوں کو واپس کیئے گئے جنہیں باقاعدگی سے ماہوار راشن خرید کر اُن کے گھر بھجوایا جاتا تھا۔ اللہ مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

حواشی

۱..... زیر نظر مضمون میں درج کچھ باتوں کے بارے میں میرے رفیق غلام رسول گڈھا (حسرت گڈھا) نے کہا کہ وہ بخشی خاندان کے بارے میں اچھی خاصی جانکاری رکھتا ہے۔اس کے کہنے کے مطابق بخشی خاندان کا تعلق اوبر (ٹنگمرگ) سے تھا جہاں سے وہ پتلی پورہ چھتہ بل منتقل ہوا۔

۲..... بخشی صاحب کے والد کی شادی خانقاہ سوختہ کے..... بٹ کی بٹی سے طے ہوئی اور وہ خانہ داماد بن کر وہیں رہنے لگے۔

۳..... ان کی ذات بٹ تھی۔ جنگ عظیم کے زمانے میں فوج میں بھرتی ہوئی۔ واپسی پر اپنی بڑی بڑی مونچھوں کی وجہ سے خان کہلانے لگے اور یہی ذات ٹھہری۔

۴..... بخشی صاحب کے ایک ہم درس، ہمعصر اور رفیق ایم اے رینہ، اپنے ایک مضمون 'بخشی غلام محمد..... خاکی ونوری نہاد' میں لکھتے ہیں کہ بخشی صاحب ہرگز اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بلتستان جانے کے حق میں نہیں تھے۔مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے خانگی حالات بالکل ناتسلی بخش تھے۔غربت اور تنگدستی سے اکثر عاجز رہتے تھے۔

۵..... ایسا لگتا تھا کہ یہ ۱۹۲۳ء کے آس پاس کا زمانہ ہوگا۔اس کی تائید ایم اے رینہ کے مضمون سے بھی ہوتی ہے۔"راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۲۹ء کی سردیوں میں بخشی صاحب لاہور میں تھے۔کھادی بھنڈار کے کام سے دل برداشتہ ہو کر کسی اور دھندے میں روپیہ لگانا چاہتے تھے"۔(ادارہ)

۶..... بخشی صاحب کے عیسائی مشنری سکول کیلئے منتخب کئے جانے کے بارے میں ایم اے رینہ نے 'شیرازہ' (اردو جلد ۱۲، شمارہ ۲، ۳) میں اپنے مضمون 'بخشی صاحب..... خاکی ونوری نہاد' میں ایک واقعہ کا یوں ذکر کیا ہے:

'ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسلامیہ ہائی سکول اور مشن سکول میں ہاکی میچ ہو رہا تھا۔دونوں طرف طلباء اپنے کھلاڑیوں کو شاباش کہہ رہے تھے۔اتنے میں چند طلباء نے ہوٹنگ شروع کی۔ ہیو وستا..... اسلامیہ سکول چ آلہٕ ہن' کی آواز کے ساتھ چند ناشائستہ الفاظ بھی کہے گئے۔طرفہ کہ اسلامیہ ہائی سکول کا کپتان محمد اسماعیل شال بہترین کھیل کا مظاہرہ کر رہا تھا اور مشن سکول پر دو گول کی برتری حاصل کی تھی۔جب کھیل کا وقفہ ہوا مشن سکول کے طلباء کو چاکلیٹ، لیمن، سوڈا وغیرہ ملے۔دوسری طرف اسلامیہ ہائی سکول کے منتظمین نے کشمیری قہوہ اور قلم اپنے کھلاڑیوں کو چینی فنجانوں میں پیش کیا۔ہر پیالی میں الائچیوں کی بہتات تھی۔اسی لئے اسلامیہ ہائی سکول کی الہن مشہور ہوئی۔وقفہ میں پھر

جب ایسی آوازیں بلند ہوئیں تو بخشی صاحب کو سخت غصہ آیا۔ اور اپنے ہمنواؤں کے ساتھ ان طلباء پر یلغار کی اور انہیں خوب پیٹا۔ یہ تماشا مسٹر بسکو اور ان کے انگریز بھی دیکھ رہے تھے...... دوسرے روز علی الصبح سکول میں دعا وغیرہ کے بعد ہم سب کو جو بخشی صاحب کی پارٹی میں شامل تھے سکول کے تمام طلباء کے سامنے نام لے کر اسٹیج پر بلایا گیا۔ ہم پر یہ الزام تھا اپنے سکول کی ہار پر خوشی منانا، کلاس میٹوں پر حملہ کرنا اور مخالف سکول کی حمایت پر کمربستہ ہونا۔ جو کہ سکول کے آداب ولوازمات کی بُنیاد کے خلاف ہے۔ ہم سب تو چُپ تھے بخشی صاحب نے بَرملا کہا کہ مخالف سکول پر گند اُچھالنا، گالیاں دینا، غیر مہذب الفاظ استعمال کرنا اور مذہبی تفاخر کو ہوا دینا اگر کسی سکول یا اِدارہ کی بُنیاد ہو تو میں اِس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ یہ حضرت مسیح کے فلسفہ، پیغام انسانیت کے سراسر خلاف ہے۔ یہ الفاظ سنکر شنکر پنڈت ہیڈ ماسٹر نے سَر جھکا لیا اور مسٹر بسکو نے تمام طلباء کو اُپنی کلاسوں میں جانے کیلئے کہا۔ کذب و افترا، زور زبردستی کے خلاف بخشی صاحب کی یہ پہلی بغاوت تھی۔ اِس کا بہت اچھا ردِّعمل ہوا۔ انگریز مشنری کے مبلغوں کی نظریں اسی وقت سے بخشی صاحب پر پڑیں۔ یہ ان کی بہت خاطر تواضع کرنے لگے۔ یہاں تک کہ فورتھ ہائی (نویں جماعت) میں ہی مشنری نے ان کو لداخ، بلتستان کی تبلیغی مہم پر روانہ کیا۔ مسٹر بن بٹن بخشی صاحب کے خاص مہربان تھے۔ بن ٹن اس کرسچن مِشن کے سَربراہ تھے"۔ (ادارہ)

۷.....حسرت صاحب کے مطابق وہ لداخ نہیں بلکہ کاشغر گئے تھے۔

۸.....ایم اے رینہ نے اپنے مضمون میں اس ضمن میں لکھا ہے:

"اس زمانہ میں بخشی صاحب نے اُپنے ایک دوست اور رشتہ دار کو جو چِٹھی لکھی تھی اُس کا مفہوم یہ تھا کہ 'بوٹے' دھڑا دھڑ کرسٹان بن رہے ہیں۔ مگر میں اُپنے مسلمان بھائیوں کو دین پر قائم رہنے کی تلقین کر رہا ہوں اور میرا مشن کامیاب ہو رہا ہے۔ اِس چِٹھی نے بخشی صاحب کے دوستوں اور رشتہ داروں میں 'دیدار' کی کیفیت پیدا کی۔ ہر ایک اس کو دیکھنے آتا اور دیکھنا چاہتا کیونکہ یہاں عام افواہ تھی کہ بخشی صاحب کرسٹان بنکر اَب اس کی تبلیغ کر رہے ہیں...... اور آخر بخشی صاحب تومند جوان کی طرح گھر لوٹے۔ مشنری کے ساتھ ان کے تعلقات کلیتاً ختم ہوئے'۔ ادارہ)

۹.....اس سے بہت پہلے آ گئے تھے۔

۱۰۔۔۔۔۔ ایم اے رینہ لکھتے ہیں:

"۱۹۲۵ء میں سرینگر میں کھادی کا کچھ چرچا ہونے لگا تھا اور کانگریس نے برطانوی ہندوستان میں سودیشی تحریک شروع کی تھی۔ بخشی صاحب فوراً بائیکاٹ کی اِس تحریک میں شامل ہوگئے اور کھادی بھنڈار میں ملازمت کا موقعہ ملا۔ (ادارہ)

۱۱۔۔۔۔۔ ایم اے رینہ کے مطابق جولائی ۱۹۳۱ء میں بخشی صاحب کلکتہ میں تھے۔ جُوں ہی انہوں نے سنا کہ مادرِوطن میں طاغوت خون کی ہولی کھیل رہا ہے فوراً واپس آگئے۔ اپنے ماموں، والد اور والدہ کی اِجازت سے اِس آگ میں کود پڑے۔

۱۲۔۔۔۔۔ اِس واقعہ کا ذکر ایم اے رینہ نے یوں کیا ہے:

"۲۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کی رات کو اُپنے رفیقوں کے ساتھ جامع مسجد پہنچے۔ رات کو ہلکی بارش ہورہی تھی۔ اِسی سرد و خشک فضا میں نہائے اور نماز پڑھی۔ ربِ کعبہ کی طرف دستِ دراز کیے اور اشک جاری ہوئے۔ شاید اِس وقت بخشی صاحب نے اپنے مالکِ حقیقی سے جو دُعا مانگی تھی، قبول ہوئی۔ اس موقعہ پر دوستوں میں سے صرف راقم الحروف ہی اُن کے ساتھ رہا۔ صبح سویرے لوگوں کے جمِ غفیر میں بخشی صاحب اسٹیج پر آئے اور تقریر کی۔ اِس وقت تقریر سے زیادہ شخصیت کی طرف ہی دھیان رہتا تھا۔ .... کوئی کہتا تھا گلہ گاندھی ہے، کوئی گلہ بخشی اور کوئی براری پورہ کا مامہ بخشی پکارنے لگا۔ سب کی زبان پر آفریں و مرحبا کے الفاظ تھے اور جذبات بھرے لہجہ میں کہتے تھے کہ واقعی یہ نوجوان لڑکپن سے بہادر اور نڈر تھا۔ آج بھی غازیوں کی طرح ظالموں اور جابروں کو للکار رہا ہے۔ اِس کے بعد گاندھی اور دُوسرے تمام نام حذف ہوئے اور خوش بختی کیلئے لفظ بخشی عام ہوا۔ (اِدارہ)

۱۳۔۔۔۔۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں آل جموں و کشمیر مسلم پولیٹکل کانفرنس کے قیام کے بعد اِس کے پہلے سالانہ اجلاس کا اہتمام، ہزاروں ڈیلی گیٹوں کیلئے طعام و قیام کا اِنتظام، جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام، اطلاعات اور طبی سہولیات کا انصرام ...... یہ سب بخشی صاحب نے کچھ اِس طرح انجام دیا کہ سبھی عش عش کر اُٹھے۔ ایم اے رینہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ جب بھی تحریک کو کسی مشکل سے دُوچار ہونا پڑا تو اُس وقت بخشی سینہ سپر ہو جاتا۔ اُس نے مزدور تحریک منظم کی۔ کشمیر لیبر یونین کی داغ بیل ڈالی۔ کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن، ٹانگہ ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے موجد بھی بخشی صاحب ہی تھے۔

۱۴۔۔۔۔۔ بخشی صاحب نے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے تحت انقلابی تحریک کی قیادت کی
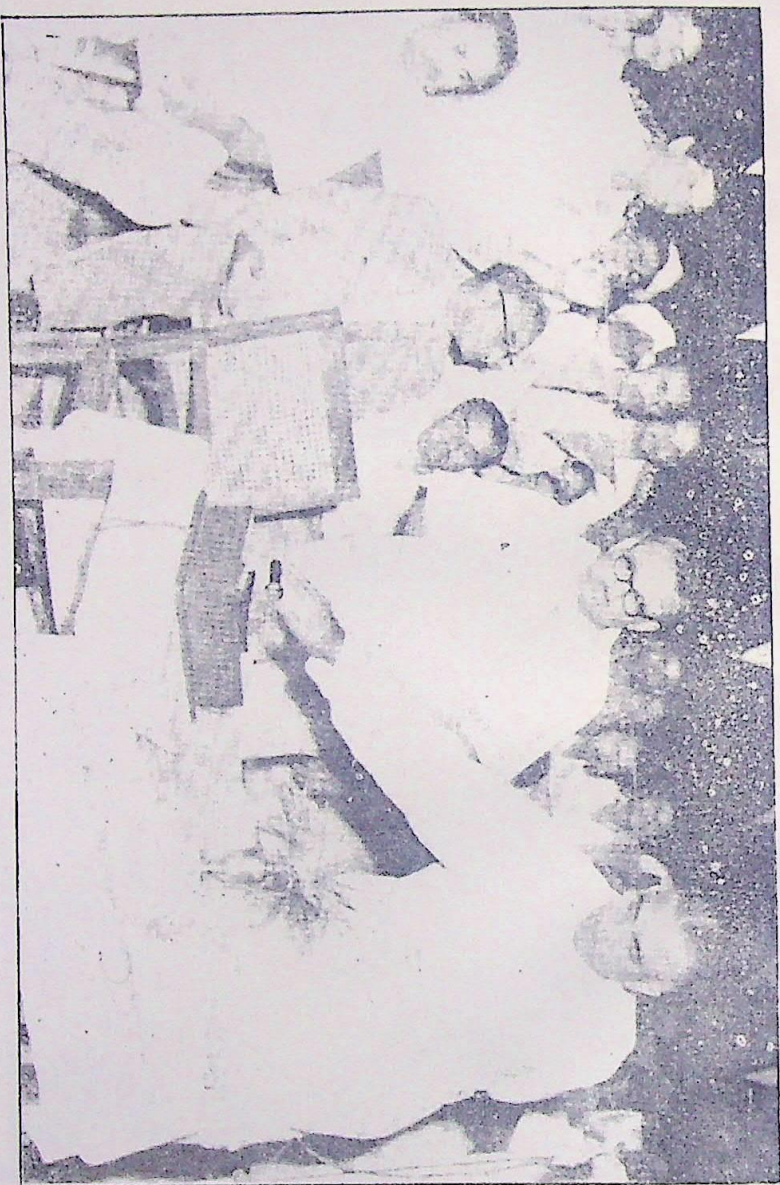
بخشی صاحب۔ فلم نگری ممبئی میں گراما فون ریکارڈ پر نیا گیت بجاتے ہوئے
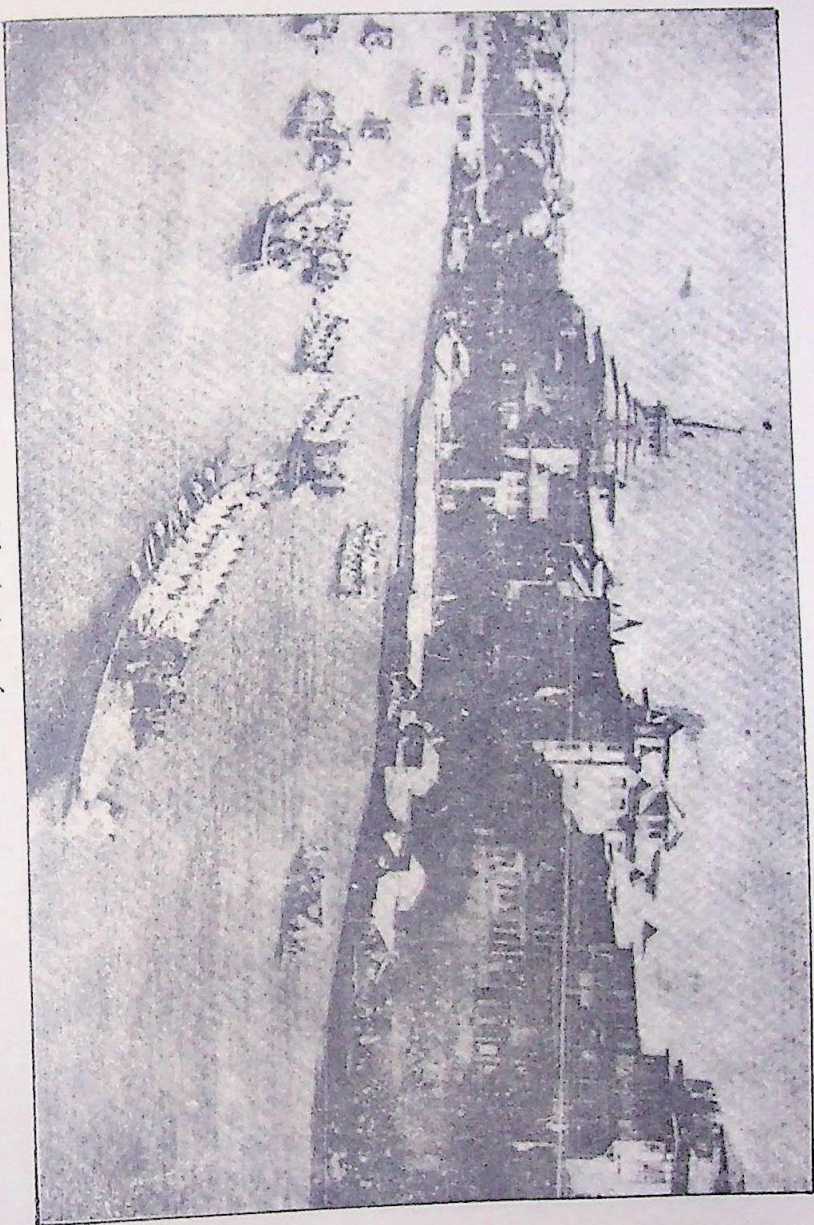
دریائی جلوس کی اگوائی
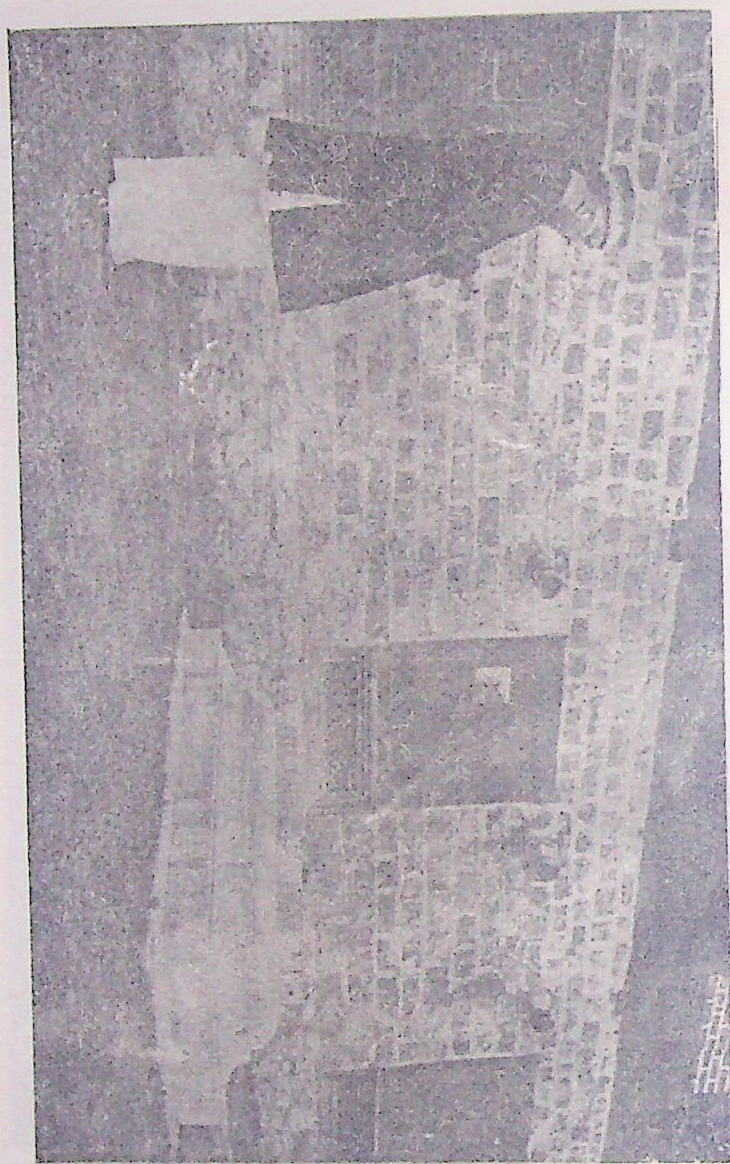
بخشی صاحب کی اہلیہ

تھی اور انہیں دو سال کی ساز ہوگئی تھی ۔ رہائی کے بعد سرینگر میں اُن کا پُرتپاک اِستقبال ہوا۔ اور سپاسنامہ میں انہیں پہلی بار خالدِ کشمیر کہا گیا۔ (ادارہ)

۱۵..... ایم اے رینہ کے مطابق بخشی صاحب کو گانا سننے کا بہت شوق تھا اور گانے کی محفلوں میں اکثر ان کے ساتھ جایا کرتے۔ ایک ایسی ہی محفل کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

> ''مشہور صوفی شاعر احمد بٹہ واری مرحوم نے عرسِ خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کی تقریب پر حیدر پورہ میں مجلسِ سماع منعقد کی تھی۔ وہ خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاتے تھے۔ رباب اور سارنگی میں یگانگت نہ تھی۔ بخشی صاحب نے کسی کے کان میں یہ بات کہہ دی۔ بٹہ واری صاحب نے فرمایا کہ یہ نوجوان کیا کہتا ہے۔ ایک شخص جس کا نام کبیر کچلو تھا، نے عرض کی: 'یہ کہتا ہے کہ سارنگی اور رباب ناراض ہیں'۔ بٹہ واری صاحب نے بخشی صاحب کو اپنے پاس بلایا، اس کے ماتھے کو چُوما، اور فرمایا جب زیر و بم الگ ہوں تو دَم فضول ہے۔ ایک وقت آئیگا جب تمہارا زیر و بم ایک ساتھ چلے گا مگر سُر گم کو قائم رکھنا''۔

کلام محمود گامی میں لفظ وصل کی تکرار پر بٹہ واری صاحب کی آنکھوں سے اشک جاری ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ بخشی صاحب بھی رو رہے ہیں۔ جب پوچھا تم کیوں رو رہے تھے؟ جواب دیا کہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ عجیب رِقّت طاری ہوئی۔ ویسے بخشی صاحب بے حد رقیق القلب تھے اور معمولی فسانہ فراق و ہجر سننے کے بعد آنکھیں پُرنم ہوتی تھیں۔

۱۹۵۳ءہچ اَکھ جَھلک

(بخشی صابٔنہٕ قلمدانِ وَزارت سَنبھالنہٕ پَتہٕ)

آنگنس مٔز فکرس ہکھ دِتھ وَنان اوس دلنہٕ وول
یتھ تولس چھم کاٹھہٕ وۄرتے یتھ تولس چھم لٲربیۄل
دانہٕ ارتل سٔر وگ نرخ تے چھے گُنی کتھ میۄن قول
ساڑہ نو چھم گامہٕ پیومُت، ساڑہ داہ دِم رٔٹھ سأتول
رٔٹھ سأتول گوڈہٕ لٲربیۄل
بوزہ کھٔے پۄزگُنہٕ بُرمٕژ چھم سداہ ترٕچ پُورہ کھار
سٔر وگ گٔنوِ ووٕنی، سٔر وگ گٔنو، سٔر وگ گٔنوِ ووٕنی
دژاگہ دیۄس بخشیٖن گٔرلارہٕ لار

●●●

ایم اے رینہ

بخشی غلام محمدؐ......خاکی و نُوری نہاد

آج سے کوئی ۷۵ سال قبل کی بات ہے کہ نوہٹہ چوک میں ریجنل (علاقائی) بچہ نغمہ ہو رہا تھا۔ وقت کے 'دادے' غنڈے، معززّ شہری اور کھڈ پنچ ایک بڑے شامیانے کے پیچھے اپنی اپنی ٹولی کے ساتھ 'بچہ' یعنی ناچنے والے چھوکرے کی اچھل کود اور بانڈوں کے مصنوعی وجدان میں محو تھے۔ گویا مجلس میں رِقّت طاری تھی کیونکہ حضرت ریشیؒ (ریشہ مولوؒ) کی منقبت گائی جارہی تھی۔

بازِیتہٖ لگہٖ یونازنین چالے
ریشہِ مالے ہو
ستھ زیتھ خط مادِم گرِوالے
ریشہِ مالے ہو

اُن دنوں ''بچہ نغمہ'' کا فن عموماً بانڈوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ خاص کر موضع واتھورہ میں ناچنے گانے والوں کی ٹولیاں (دھریں) زیادہ مشہور ہوتی تھیں۔ ''بچے'' عموماً بانڈوں کے قبیلوں سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ کمال بچہ (جس نے بعد میں کمال بٹ کے نام سے صوفیانہ کلام کے ترنّم سے ریڈیو کشمیر کی زینت بڑھائی)۔ مختہ بچہ

وغیرہ زیادہ مشہور تھے۔ یہ علاقہ وار شہر خاص اور قصبات میں آخر خوب دھن سمیٹ رہے تھے۔ ایسی ہی ایک پُر کیف مجلس میں یکا یک شور وغوغا بلند ہوا۔ ڈنڈے چلے، سینگوں کے بجائے ایک دوسرے پر...... جانے لگے۔ کہیں سے خون بہنے لگا، کہیں چادر اور کہیں لوئی چھینی جا رہی تھی۔ سب لوگ ایک دوسرے سے اِس جنگی ماحول کے متعلق اِستفسار کر رہے تھے۔ آخر کھوج کر کے اِتنا معلوم ہوا کہ قادر خان (مرحوم بخشی غلام محمد کے ماموں جان) کی طرف کمال بچہ ذرا زیادہ التفات کر رہے تھے اور ان کو ایک اُردو گیت دل کی گہرائیوں، ہاتھ کی جنبشوں اور گنگروں کی چھنا چھن سے سمجھا رہے تھے۔ یعنی اِن ابیات کی تفسیر بیان کر رہے تھے

تیری جدائی سے میرا دل بے تاب رہے — ہائے بے تاب رے ہائے بے تاب رہے

خونِ جگر سے نامے لکھوں قاصد کے ہاتھ دوں — ہتو جب ہاتک قاصد نے آوے

میرا دل بے تاب رے بے تاب رُہے

قادر خان چشمک کا نِشانہ بَن گئے مگر انہوں نے اَپنے قوتِ بازو اور جبروت سے دُشمنوں کی اِس یلغار کو نہ صرف روکا بلکہ جوابی حملے بھی کیئے۔ اُن کا ساتھ چند ہم مشرب اور ایک نونہال بھی دے رہے تھے اور یہ نونہال جناب بخشی غلام محمد مرحوم تھے۔ چونکہ قریباً میں بھی اُن کا ہم عمر تھا۔ اِس لئے 'کند ہم عمر با ہم عمر پرواز' میں نے اِس بانکے کو گلے لگایا تا کہ اِس پر مزید کوئی اُفتاد نہ پڑے۔ میرے چاچا صاحب بھی قادر خان قماش کے بزرگ تھے اور ہاتھ پیَر مارنے کے خوب ماہر تھے۔ قبلہ چاچا صاحب غلام قادر خان کی طرف سُلہ ٹُھلہ کے نام سے مشہور تھے۔ ایک مشاہدہ کے مطابق سَر کی قوت سے پختہ اینٹ کے دو ٹکڑے فرماتے تھے۔ بہر حال اِسی عجیب کشمکش اور جنگ وجدال کی محفل میں بخشی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات بڑھتے

بڑھتے کلاس رُوم سے لیکر عمر کے آخری مرحلہ تک دوستی اور راز و نیاز تک جاری رہی۔
ہمیشہ دوست رہے اور رقابت و حسد سے دُور۔ البتہ رشک ہمیشہ غالب رہا۔

بچہ نغموں میں لڑائی، دھینگا مشتی لازم وملزوم بات ہوتی تھی۔ بلکہ اگر ان مجالس نغمات میں شر و فساد اور زور آزمائی نہ ہو تو محفل بے کیف سمجھی جاتی تھی۔ علاقائی برتری، شخصی زور آزمائی اور شیر دلی کے مظاہرہ کیلئے یہ ایک بہترین موقعہ ہوتا تھا اور ان ہی مواقع پر غنڈوں، دادوں اور خواہ مخواہ مقدم دیہہ لوگوں کو سٹیفکیٹ عطا ہوتے تھے۔ جس طرح کوئی دانشور، عالم فاضل کسی مخصوص مسئلہ پر تحقیقات کرنے کیلئے تھیسز لکھنے کے جتن کرتا، اور اس محنتِ شاقّہ کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرتا ہے، بعینہٖ اُسی طرح اگر کسی من چلے نے اِنتہائی ڈھٹائی سے بچہ نغموں کے دوران ہڑبونگ مچانے کی کوشش کی، خاص کر پھرن کی تہوں میں چھُپائے ڈنڈے، قمچے، تازن یعنی کوڑے کو معمولی بہانہ بنا کر بچے یا بانڈوں کی سرد مہری سے دِل برداشتہ ہو کر اپنے اِس ماڈرن ویپن (اِسلحۂ جدید) کو نکال کر ہمہ تن گوشِ سامعین باتمکین پر بلاایں وآں بغیر پس و پیش دے مارے اور نتیجتاً یہ محفل سماع درہم برہم ہو جائے، دو چار کی چوٹیں لگیں، کچھ خونِ ناحق گرے، مختلف ٹولیوں کے "پٹھہ در" ایک دُوسرے پر جھپٹ پڑیں اور ہاؤ ہُو کا عالم پیدا ہو تو سمجھ لیجئے کہ اِس شخص کو پی ایچ ڈی کی ڈِگری مل گئی اور اِس نے غازیوں کا درجہ بھی حاصل کرلیا۔ شہر و دیہات میں اس کی جرأت، بہادری اور تنومندی کے چرچے عام ہوئے۔ جس راستے سے یہ 'صاحب جواں شیر' قدم رنجہ فرمائیں' دکان دار اپنی گرگریاں تازہ کر کے چلم پیش کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ علاقہ میں اِن کیلئے دُودھ، دَہی، میوہ اور خوانِ یغما بلا پوچھے نوش کرنے، تناول فرمانے کے حقوق حاصل

ہو جاتے ۔ لوگ تو در کنار کوتوال بھی ہاتھ مِلانے سے دریغ نہ کرتے ۔ اِس عزت وشہرت 'مولاداد' کو برقرار رکھنے کیلیۓ یہ معزّز شہری اُپنے حواریوں میں بہت سے پٹھوں کو شامل کرتے تھے جن میں ہاتھ کی صفائی کا کام کرنے والے رہزن، نقب زن، سارق، کذاب اور جعلساز قسم کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہی طبقہ استحصالی عناصر میں مبدّل ہو جاتا تھا۔ سُود خور، غلہ دار، وڈدار، خوجہ، سیاہ بازار والے، کنجرے اور دیگر بدقماش لوگ اُپنے مفادات پورے کرنے کیلیۓ انہیں استعمال کرتے تھے۔ غریب غرباء مقروض محتاج، عاجز لوگ اُن کے سامنے بے بس ہوتے تھے۔

نواکدل مشن سکول میں جب میرا داخلہ لیا گیا، تو میں نے اُپنے "بانکے دوست" کو دیکھ کر خوشی محسوس کی یہاں بخشی صاحب کے علاوہ احمد علی، غلام حسن کاؤسہ بھی ہمارے ہم جماعتی تھے۔ کھیل کُود خاص کر تیراکی اور بوٹنگ میں ہمارا درجہ سب سے اعلیٰ ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحبان جس رعب وادب کا مظاہرہ دُوسرے طلبا پر کرتے تھے ہم دو تین لڑکے اِس سے محفوظ تھے۔ شاید وہ ہماری یکجہتی یا سرپرستوں کی بالادستی سے خائف تھے۔ بخشی صاحب کے سرپرست اور مربّی اُن کے ماموں خواجہ غلام قادر خان تھے۔ میرے پُشت وپناہ چاچا خواجہ محمد سلطان ہی تھے۔ احمد علی شیعہ تھے اور اُن کے والد گرداور تھے۔ غلام حسن کاؤسہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے بخشی صاحب کے والدِ بزرگوار خواجہ عبدالغفار بقیدِ حیات تھے۔ مگر اُپنی سادہ لوحی سے اُن کا گھر میں اور نہ باہر کوئی مقام تھا۔ البتہ بخشی صاحب کی والدہ محترمہ بے حد محنتی، ملنسار، خداترس اور نیک سیرت خاتون تھیں اور اُپنے کام میں ماہر تھیں۔ خدا نے اُن کے ہاتھ میں شفا بخشی تھی۔ بخشی صاحب کے علاوہ ان کے

فرزندوں میں غلام نبی ، ولی محمد، علی محمد، عبدالمجید اور عبدالحمید تھے۔ دو ہمشیرہ بھی تھیں۔ عبدالحمید کو کسی اور رِشتہ دار نے صفا کدل میں متبنیٰ بنایا تھا۔ باقی سب مادرِ مہربان کے سایہ میں پلے۔ کہتے ہیں بخشی خاندان کا موُرثِ اعلیٰ فیض بخش نام کا ایک بُزرگ تھا جو اُطرافِ بونیار سے واردِ سرینگر ہُوا تھا اور چھتہ بل میں مستقل سکونت اِختیار کی تھی۔ غفار صاحب بطورِ خانہ داماد براری پورہ تشریف لائے تھے۔ نوا کدل پرائمری سکول سے ہم سب ہم جماعتی مشن ہائی سکول فتح کدل میں داخل ہوئے۔ یہاں ٹینڈل بِسکو کی خاص نگرانی ہوتی تھی اور آنجہانی شنکر پنڈت جیسا عالِم وفاضل انسان سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اُن دِنوں تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں میں کھیل کود کا شوق وذوق پیدا کرنے کیلئے سکول ٹورنامنٹ منعقد کئے جاتے تھے۔ اِن میں سرینگر کے کلھم چار ہائی سکول، مشن ہائی سکول، سری پرتاپ ہائی سکول، سٹیٹ ہائی سکول، باغِ دلاور خان اور اسلامیہ ہائی سکول حصہ لیتے تھے۔ تیراکی، بوٹنگ، اَپ سیٹ بوٹنگ اور دُوسرے دریائی کھیلوں میں مِشن سکول کا نمبر اوّل آتا تھا۔ دوسرے کھیلوں میں بھی اُن کو فوقیت حاصل ہوتی تھی مگر سٹیٹ سکول اور ایس پی ہائی سکول کرکٹ اور ہاکی وغیرہ میں پہلی پوزیشن حاصل کرتے تھے۔ صرف اسلامیہ ہائی سکول ہر ایک کھیل میں ''انڈا'' یعنی زِیرو حاصل کرتا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسلامیہ ہائی سکول اور مشن سکول میں ہاکی میچ ہو رہا تھا۔ دونوں طرف طلباء اپنے کھلاڑیوں کو شاباش کہہ رہے تھے۔ اِتنے میں چند طلباء نے ہوٹنگ شروع کی۔ ''ہیووُستا'' اِسلامیہ سکولچہِ اُرلہِن'' کی آواز کے ساتھ چند ناشائستہ الفاظ بھی کہے گئے۔ طُرفہ یہ کہ اسلامیہ ہائی سکول کا کپتان محمد اسماعیل شال بہترین کھیل کا مظاہرہ کر رہا تھا اور مشن سکول پر دو گول کی برتری حاصل کی تھی۔ جب

کھیل کا وقفہ ہوا مشن سکول کے طلباء کو چاکولیٹ، لیمن سوڈا وغیرہ ملے۔ دوسری طرف اسلامیہ ہائی سکول کے منتظمین نے کشمیری قہوہ اور قلم اپنے کھلاڑیوں کو چینی فنجانوں میں پیش کیا۔ ہر پیالی میں الائچیوں کی بہتات تھی۔ اسی لئے اسلامیہ ہائی سکول کی اُلہن مشہور ہوئی۔ وقفہ میں پھر جب ایسی آوازیں بلند ہوئیں تو بخشی صاحب کو سخت غصہ آیا اور اپنے ہمنواؤں کے ساتھ اِن طلباء پر یلغار کی اور انہیں خُوب پیٹا۔ یہ تماشا مسٹر بسکو اور اُن کے انگریز بھی دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہماری اِس سینہ زوری کو تو برداشت کیا گیا مگر دوسرے روز علی الصباح سکول میں دُعا وغیرہ کے بعد ہم سب کو جو بخشی صاحب کی پارٹی میں شامل تھے، سکول کے تمام طلباء کے سامنے نام لیکر اسٹیج پر بُلایا گیا۔ اِس گروپ میں بخشی صاحب کے علاوہ عبدالرحیم ڈار، راجہ اصغر علی، شعبان شیر، احمد علی، غلام حسن کاؤسہ، فدا علی اور راقم الحروف شامل تھے۔ ہم پر یہ الزام تھا کہ اپنے سکول کی ہار پر خوشی منانا، کلاس میٹوں پر حملہ کرنا اور مخالف سکول کی حمایت پر کمر بستہ ہونا، اِس سکول کے آداب ولوازمات کی بُنیاد کے خلاف ہے۔ ہم سب چُپ تھے۔ بخشی صاحب نے برملا کہا کہ مخالف سکول پر گند اُچھالنا، گالیاں دینا، غیر مہذب الفاظ استعمال کرنا اور مذہبی تعصب کو ہوا دینا اگر کسی سکول یا اِدارہ کی بنیاد ہو تو میں اِس پر لعنت بھیجتا ہوں۔ یہ حضرت مسیحؑ کے فلسفۂ پیغامِ انسانیت کے سراسر خلاف ہے۔ یہ الفاظ سُن کر شنکر پنڈت ہیڈ ماسٹر نے سر جُھکایا اور مسٹر بسکو نے طلباء کو اپنے کلاسوں میں جانے کیلئے کہا۔ کذب وافترا، زور زبردستی کے خلاف بخشی صاحب کی یہ پہلی بغاوت تھی۔ اِس کا بہت اچھا ردِ عمل ہُوا۔ انگریز مشینری کے مبلغوں کی نظریں اِسی وقت سے بخشی صاحب پر پڑیں۔ یہ اُن کی بہت خاطر تواضع کرنے لگے یہاں تک کہ فورتھ ہائی میں ہی مشینری نے ان کو لداخ بلتستان کی تبلیغی مہم پر

روانہ کیا اور مسٹر بین ٹن بخشی صاحب کے خاص مہربان بنے۔ بین ٹن اُس کرسچن مشن کے سربراہ تھے جو کافی سوچ سمجھ کے سرحدی اضلاع میں بھیجا گیا۔ یہ دُرست ہے کہ جناب بخشی ہرگز اپنی تعلیم کو اُدھورا چھوڑ کر۔۔۔۔ بلتستان جانے کے حق میں نہیں تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اُن کے خانگی حالات بالکل ناتسلّی بخش تھے۔ غرُبت اور تنگدستی سے یہ اکثر عاجز رہتے تھے۔ دو اڑھائی سال لداخ میں بحیثیت ٹیچر کے صَرف کیئے۔ اِس دَوران انگریزی مشنریوں کی تبلیغ سے بہت سے بودھ لامے کرسچن بن گئے۔ تبدیلیٔ مذہب سے جب اُن کی سماجی اور اقتصادی حالت تبدیل ہوتی نظر آئی تو عام بوٹوں (بودھوں) کا رجحان کرستانی کی طرف ہونے لگا۔ اِس زمانے میں بخشی صاحب نے اَپنے ایک دوست اور رشتہ دار کو جو چِٹھی لکھی تھی اِس کا مفہوم یہ تھا کہ بوٹے دھڑا دھڑ کرستان بن رہے ہیں مگر میں اَپنے مسلمان بھائیوں کو دِین پر قائم رہنے کی تلقین کررہا ہوں اور میرا مِشن کامیاب ہورہا ہے۔ اِس چِٹھی نے بخشی صاحب کے دوستوں اور رِشتہ داروں میں دیدار کی کیفیت پیدا کی۔ ہر ایک اِس کو دیکھنے آتا اور دیکھنا چاہتا کیونکہ یہاں عام اُفواہ تھی کہ بخشی صاحب کرستان بن کر اَب اِس کی تبلیغ کررہے ہیں۔ اِس سے کچھ عرصہ قبل غلام محمد بقال (مامہ بقال) رعناواری اور غلام قادر دچو (قادر منزرو) خواجہ بازار نے کرستانی قبول کی تھی اور انہیں کرسچن بیویاں بھی مِل گئی تھیں۔ اِسی لئے بخشی صاحب کے متعلق کچھ تشویش پھیل گئی تھی جو اِس چِٹھی سے دُور ہوئی اور آخر بخشی صاحب تنومند جوان کی طرح گھر لوٹے۔ مشنری کے ساتھ اُن کے تعلقات کلیتاً ختم ہوئے۔

۱۹۲۵ء میں سرینگر میں کھادی کا کچھ چرچا ہونے لگا تھا اور کانگریس نے برطانوی ہندوستان میں سودیشی تحریک شروع کی تھی۔ بخشی صاحب فوراً بائیکاٹ کی

اس تحریک میں شامل ہو گئے اور کھادی بھنڈار میں ملازمت کا موقعہ ملا۔ انہیں گُلہ گاندھی کہہ کر پکارا جانے لگا۔ بخشی صاحب کئی سال تک کھادی بھنڈار کے دفتر واقع سیّد منصور شورُوم اور ہری سنگھ ہائی سٹریٹ کی دکان میں کام کرتے رہے۔ پانپور کے پٹو اور پشمینہ کارخانوں میں اُن کا کام تسلی بخش رہا۔ راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۲۹ء کی سردیوں میں بخشی صاحب لاہور میں تھے۔ کھادی بھنڈار کے کام سے دِل برداشتہ ہو کر کسی اور دَھندے میں رُوپیہ لگانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے برادران نے بڑے پیمانہ پر دَرزیوں کا کام شروع کیا۔ ایک اور صاحب، جو کھدر بھنڈار میں کام کرتے تھے لاہور میں ملے۔ اُن کا کہنا تھا کہ بخشی صاحب کو سری نگر کھادی بھنڈار سے اِس لئے الگ کیا گیا تھا کیونکہ اُنہوں نے کچھ بے ضابطگیاں کی تھیں۔ جب میں نے یہی بات بخشی صاحب کے سامنے دہرائی تو یہ راوی صاحب کھسیانے ہونے لگے اور جب بخشی صاحب تاڑ گئے کہ اس نے کوئی حماقت کی ہے تو اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو! کھدر بھنڈار میں چند کھدر پوش ڈاکو، چوروں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ میں ایسے بَدقماش لوگوں کی موجودگی سے اِس قومی اِدارہ کو تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ یہ اِدارہ اِس انسان کی طرف منسوب ہے جو اِنسانیت، انصاف اور مَساوات کی لڑائی لڑ رہا ہے اور ہم اَپنے ذاتی فائدہ کیلئے اِس کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیں۔ میں نے کراچی میں صرف دو ہفتہ رہ کر پُرانے کوٹوں کے بنڈل خرید کر کھدر بھنڈار کی دو سال کی تنخواہ کمائی ہے۔ اِس کے بعد ڈیڑھ سال تک بخشی صاحب مختلف کام کرتے رہے اور ساتھ ساتھ بچہ نغموں اور حافظہ نغموں کی چاشنی کا حَظ اٹھاتے رہے۔ جہاں کہیں اَچھے گانے والے یا گانے والی کا چرچا ہوتا، یہ وہاں پہنچ جاتے تھے۔ چھکری ہو یا قوالی، صحرائی ہو یا صوفیانہ، 'ننند بائتھ' ہوں یا

دَف.....شوقِ سماع کا یہ عالم تھا کہ بخشی صاحب معہ اُپنے رفقاء کے وہاں پہنچ جاتے تھے۔اِس سلسلہ میں چند ایسے واقعات کا تذکرہ بے جانہ ہوگا جن سے یہ ظاہر ہوگا کہ بخشی صاحب فنِ موسیقی کے کس قدر دلدادہ اور شیدائی تھے۔

۱۹۳۰ء سے قبل گاوٗ کدل اور مائسمہ کے بازاروں اور تاشوان میں گانے والی حافظائیں ہوتی تھیں۔ یہ حافظائیں ناچتی اور گاتی بھی تھیں۔ ایک دفعہ تاشوان میں ایک نئی حافظ کا وَرود ہوا، بخشی صاحب نے اُس کے گانے کی تعریف سنی تھی اور مجھے ساتھ لیکر اُس کے یہاں پہنچایا۔ گانا سُنا، کچھ ناز نخرے دیکھے، بخشی صاحب نے حافظ کے سازندوں کو سمجھایا کہ اُستاد صِدہ جُو اور اُستار مضان جُو سے اِس نئی نویلی دُلہن کو ریاض کراوٗ تو یہ صوفیانہ موسیقی میں مشاّق ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور اِس حافظ نے فنِ موسیقی میں ایسا نام پیدا کیا کہ اس کے گانوں کے ریکارڈ بنوائے گئے۔

اِسی طرح ایک رات کو دوٗ بجے کے قریب دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی، جاگا تو دیکھا بخشی صاحب قمیض پائجامہ پہنے پیروں کے گھنگھروں (رُونہِ گوڈ) کی تلاش میں تھے۔ اِن کے حکم کے سامنے سرتابی کی جرأت نہیں تھی۔ ساتھ چلا اور خانیار پہنچ کر یہ چیز حاصل کی۔ فوراً اُس جگہ پہنچے جہاں اِس کی ضرورت تھی۔ کیا دیکھتا ہوں ترال سے ایک خوب رُو رَقاص چند آدمیوں کی ڈھری میں رسول میر کا کلام۔

دِل بندہٖ دل آزارہٖ دل آرامہٖ نگارو

گل خندہٖ ،گل روخسارہٖ ، گل اندامہٖ نگارو

گا رہا تھا۔ واقعی ترنّم وجد آمیز تھا۔ اِس کی آواز اتنی دلکش، دِل رُبا اور سُریلی تھی اور تلفّظ صاف اور فصیح تھا کہ مجلس میں بہت سارے بزرگ عش عش کر اُٹھتے تھے۔ بخشی صاحب نے اِس کو گھنگھرو پہنائے اور ناچنے کو کہا اور سماں ایسا بندھا کہ

ہوش و حواس اڑ گئے۔ بعد میں یہ بچہ اِتنا مشہور ہُوا کہ لوگ اُس کی ایک اُدا اور نغمہ کیلئے ترس رہے تھے۔ ایک اور واقعہ بھی سُن لیجئے۔ مشہور صوفی شاعر احمد بٹہ واری مرحوم نے عرسِ خواجہ غریب نواز اجمیریؒ کی تقریب پر حیدر پورہ میں مجلسِ سماع منعقد کی تھی۔ یہ خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاتے تھے۔ رُباب اور سارنگی میں یگانگت نہ تھی۔ بخشی صاحب نے کسی کے کان میں یہ بات کہی۔ بٹہ واری صاحب نے فرمایا کہ یہ نوجوان کیا کہتا ہے۔ ایک شخص جس کا نام کُبر کچلو تھا، نے عرض کی کہ یہ کہتا ہے کہ سارنگی اور رُباب ناراض ہیں۔ بٹہ واری صاحب نے بخشی صاحب کو اُپنے پاس بلایا، ماتھے کو چوما اور فرمایا جب زیر اور بم الگ ہو تو دم فضول ہے۔ ایک وقت آئیگا جب تمہارا زیر اور بم یک ساتھ چلے گا۔ مگر سرگم یک ساتھ چلے گا، سرگم کو قائم رکھنا۔ اِس محفل میں محمود گامی کی ایک غزل شروع ہوئی۔

لول آم یُورُ یِیہِ نایے ! کرِہ ہس بو لولہِ متہِ لایے

ژھارُن چھُ وصلک دَوا ! محمود گامی بے نوا

ہول کا ستم ہایے خدایے

لول آم یُورُ یِیہِ نایے

لفظ وصل کی کئی بار تکرار ہوئی اور بٹہ واری صاحب کی آنکھوں سے اُشک جاری ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ بخشی بھائی رو رہے ہیں۔ جب اُن سے پوچھا کہ تم کیوں رو رہے تھے جواب دیا کہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ عجیب رقت طاری ہوئی۔ ویسے بخشی صاحب بچہ نغموں، موسیقی کی محفلوں کے دِلدادہ اُس وقت سے تھے جب یہ مالی لحاظ سے غریب تھے۔

آخر وہ مرحلہ آیا جب قوم نے بخشی غلام محمد کو پُکارا، جہاں اس کی قابلیت، دلیری، جبروت اور بالغ نظری کے جوہر کھلنے والے تھے۔ جب جولائی ۱۹۳۱ء میں

گولی چلنے کا واقعہ آیا، اُن دنوں بخشی صاحب کلکتہ میں تھے۔ جوں ہی انہوں نے سنا کہ مادرِ وطن میں طاغوت خون کی ہولی کھیل رہا ہے، فوراً واپس آئے۔ ماموں جان خواجہ قادر خان، والدِ بزرگوار بخشی غفار صاحب اور والدہ محترمہ کی اجازت سے اِس آگ میں کود پڑے جہاں اِنسان کیلئے بھسم ہونے کے زیادہ خدشات تھے۔ ۲۴ر ستمبر ۱۹۳۱ء کی رات کو اپنے رفیقوں کے ساتھ جامع مسجد پہنچے، رات کو ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اسی سرد و خشک فضا میں نہایا اور نماز پڑھی۔ رَبِ کعبہ کی طرف دست دراز کئے اور اشک جاری ہوئے۔ شاید اُس وقت بخشی صاحب نے اپنے مالکِ حقیقی سے جو دُعا مانگی تھی، وہ قبول ہوئی۔ اِس موقعہ پر دوستوں میں سے صرف راقم الحروف ہی اُن کے ساتھ رہے۔ صبح سویرے لوگوں کے جمِ غفیر میں بخشی صاحب سٹیج پر آئے اور تقریر شروع کی۔ اُس وقت تقریر سے زیادہ شخصیت کی طرف ہی دھیان رہتا تھا۔ کوئی کہتا تھا گلہ گاندھی ہے۔ کوئی گلہ بخشی اور کوئی براری پورہ کا ممہ بخشی پکارنے لگا۔ سب کی زبان پر آفرین و مرحبا کے الفاظ تھے۔ اور جذبات بھرے لہجہ میں کہتے تھے کہ واقعی یہ نوجوان لڑکپن سے بہادر اور نڈر تھا۔ آج بھی غازیوں کی طرح ظالموں اور جابروں کو للکار رہا ہے۔ اِس کے بعد گاندھی اور دوسرے تمام نام حذف ہوئے اور خوش بختی کیلئے لفظ بخشی عام ہوا۔ پھر اِسی بخشی نے بڑے بڑے معرکے سر کئے اور اپنی قابلیت کی دھاک بٹھا دی۔ قارئین یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ جب کبھی کشمیر کی لیڈر شپ اور حکومتِ وقت کے درمیان کوئی مفاہمت یا سمجھوتہ ہُوا تو اُن مواقع پر بڑے بڑے لیڈروں نے نیم گرم معافی نامے لکھ کر رہائی حاصل کی۔ صرف ایک بخشی تھا جس نے کبھی ایسے ناموں پر دستخط نہیں کئے۔ یہاں تک کہ دستاویزِ الحاق پر دستخط کرنے والوں میں بخشی صاحب شامل تو نہ تھے مگر ایفائے وعدہ

پر آخر دم تک قائم رہے۔

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں آل جموں و کشمیر مسلم پولیٹکل کانفرنس قائم ہوئی۔ اِس کے پہلے سالانہ اجلاس کا انتظام واہتمام کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ہزاروں ڈیلی گیٹوں کیلئے قیام وطعام کا اِنتظام، جلسے اور جلوسوں کا اہتمام، اطلاعات وطبی سہولیات کا انصرام۔ یہ سب کچھ اِس نوخیز بخشی بخشی ہی نے انجام دیا اور اُپنے اور پرائے سب عش عش کر اُٹھے۔ اِس کے بعد جب تحریک کو کسی مُشکل سے دُوچار ہونا پڑا تو اس وقت بھی یہی بخشی سینہ سپر ہوتا تھا۔ اُس نے مزدور تحریک منظّم کی۔ کشمیر لیبر یونین کی داغ بیل ڈالدی۔ کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن (کے ایم ڈی)، ٹانگہ ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے مؤجد بخشی صاحب ہی تھے۔ بڑے بڑے لیڈر گھر بیٹھے ڈھینگیں مارتے تھے لیکن بخشی خون پسینہ ایک کر کے اُن کے لئے میدان ہموار کرتے تھے۔

ایک مختلف ایسا بھی آیا کہ جب لیڈر شپ کی خودسری سَر نکالنے لگی۔ عوام متنفّر ہونے لگے تو بخشی صاحب نے ینگ مینز مُسلم ایسوسی ایشن کے تحت انقلابی تحریک کی قیادت کی اور ڈیفنس آف انڈیا رُولز کے تحت اِنہیں دُو سال کی سزا ہوئی۔ اور یہ میعادِ اسیری ریاسی کے پُر آشوب جیل خانے میں گزار دی۔ اُن کی اِس اسیری سے تحریک میں نئی زندگی پیدا ہوئی۔ جب رہائی کے بعد سری نگر میں اُنکا شاہانہ استقبال ہوا تو سپاسنامہ میں انہیں پہلی بار خالدِ کشمیر کہا گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۴ء کا ہے۔ طرفہ یہ ہے کہ بخشی صاحب سب کچھ ہونے اور کرنے کے باوجود کچھ بھی نہ تھے۔ یعنی کبھی بھی تنظیم کی صدارت قبول نہ کی جبکہ احمد یار خان، شیخ عبدالحمید، سردار بُدھ سنگھ صدر بنے۔ جو اُن کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہ تھے۔ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں مبدّل کرنے کے لئے ان کا زبردست ہاتھ تھا۔ اِس کے جواز میں

باقی لیڈر پہلے ذاتی مفاد کی باتیں سوچتے تھے مگر بخشی صاحب کہتے تھے کہ میں یہی سمجھتا ہوں کہ مظلوم، محکوم غریب اور مفلوک الحال اِکٹھے ہو کر سوچیں اور اقدام کریں تو کامیابی یقینی ہے۔

آل انڈیا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کے سرکردہ لیڈروں میں بخشی صاحب کا شمار اس لئے ہوا کہ بیرونی لیڈر انہیں بالغ نظر اور معاملہ فہم سیاست دان سمجھتے تھے۔ اُودے پُور اجلاس اسٹیٹ پیپلز کانفرس میں راقم اُن کے ساتھ تھا۔ پنڈت نہرو اور دُوسرے رہنما ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ چلتے چلتے اجمیر شریف میں قوالی کی مجلس قائم کر کے جیب ہلکی کروائی۔

اُن کے جوہر قابلیت اُس وقت کھُلے جب اُنہوں نے جلاوطنی میں تحریک کشمیر چھوڑ دو کی قیادت کی۔ یہ اُن ہی کا کمال تھا کہ تحریک کشمیر چھوڑ دو کی حمایت مسلم لیگی لیڈروں اور کانگریس دونوں نے کی۔ اُن کا رابطہ جیلوں میں تمام کارکنوں کے ساتھ رہا اور ان کے اخراجات پورے کرتے رہے۔ پبلسٹی اور پروپیگنڈا سے بیرونی ممالک تک متاثر ہوئے۔

اِس دوران راقم الحروف کو اُن سے ملنے کا اِتفاق ہوا۔ شاید اپریل ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا۔ مجھے کانفیڈنس میں لے کر فرمانے لگے۔ اب یہ تحریک کا آخری دَور ہے۔ ہندوستان آزاد ہو رہا ہے پاکستان بن رہا ہے۔ لیکن ہم ابھی تک غیر یقینیت میں ہیں۔ آخر ہمیں اپنے مستقبل کے لئے کچھ نہ کچھ سوچنا چاہیے۔ میں نے ایک بھولے بھالے اِنسان کی طرح بخشی صاحب سے اِس سلسلہ میں مزید کچھ سوالات کیے تو جواباً کہا کہ نیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ سوپور ۱۹۴۵ء کے موقعہ سے قبل سازشوں کے تحت مجھے ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی اور میں مجبوراً نورالدین

نوشہری کے ساتھ جنگلات کا کام کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ قدرت نے میری مدد کی اور دیرینہ رنجشوں کو چھوڑ کر میدان میں آیا ہوں۔ لیڈر شپ بھدرواہ میں مزے لے رہی ہے اور میں یہاں آگ میں جل رہا ہوں"۔

راقم الحروف گواہ ہے کہ اُن دنوں نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ، شوکت حیات خان اور میاں افتخار الدین وغیرہ مسلم زعما کس قدر بخشی صاحب کی ناز برداری کر رہے تھے۔ دُوسری طرف صرف بخشی کو ملنے کے لئے کئی بار پنڈت جواہر لال نہرو مختلف بہانوں سے لاہور آتے رہے اور اِنہیں حالات سے واقف کراتے رہے۔ اس میں شک نہیں کہ بخشی صاحب کو دُونوں اَطراف سے امداد مل رہی تھی۔ مگر کشمیر بلڈنگ واقعہ قلعہ گوجر سنگھ میں رہایشی کیمپ کے ساتھ بڑا لنگر جاری تھا۔ اِس کے اخراجات تو پورے کرنے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات پر اور انسانی جانیں ضایع ہونے پر بخشی صاحب خون کے آنسوں روتے تھے۔ جب مئی ۱۹۴۷ء کے مہینہ میں' میں سرینگر آنے لگا تو چند دن مزید رو کے رکھا اور ٹرین میں دہلی چلے گئے۔ اِسی ٹرین کو شریف پورہ اُمرتسر میں روک کر قتلِ عام کیا گیا تھا۔ حالانکہ بخشی صاحب کو کہا گیا تھا کہ خطرہ ہے مگر اُنہوں نے جان کی بازی لگا کر سفر کیا تھا۔

واپسی پر انہوں نے تین چٹھیاں میرے حوالے کیں۔ ایک شیخ صاحب کے نام بھدرواہ جیل پہنچانی تھی۔ دوسری خواجہ محی الدین قرہ کے نام، جو سرینگر میں اَنڈر گراؤنڈ لیڈر تھے۔ تیسری مظفر آباد جیل میں مولانا محمد سعید مسعودی کے نام تھی۔ دو چٹھیاں راقم نے خود مقام تک پہنچائیں۔ البتہ مظفر آباد کی چٹھی کسی اور ذریعے سے روانہ کی۔ بخشی صاحب نے اعتماد میں لے کر مجھے اِن چٹھیوں کا مفہوم بتایا، وہ یہ تھا کہ"......انگریز ملک چھوڑ رہا ہے۔ مگر تقسیم کے بعد یہی وقت ہمارے لئے سوچنے کا
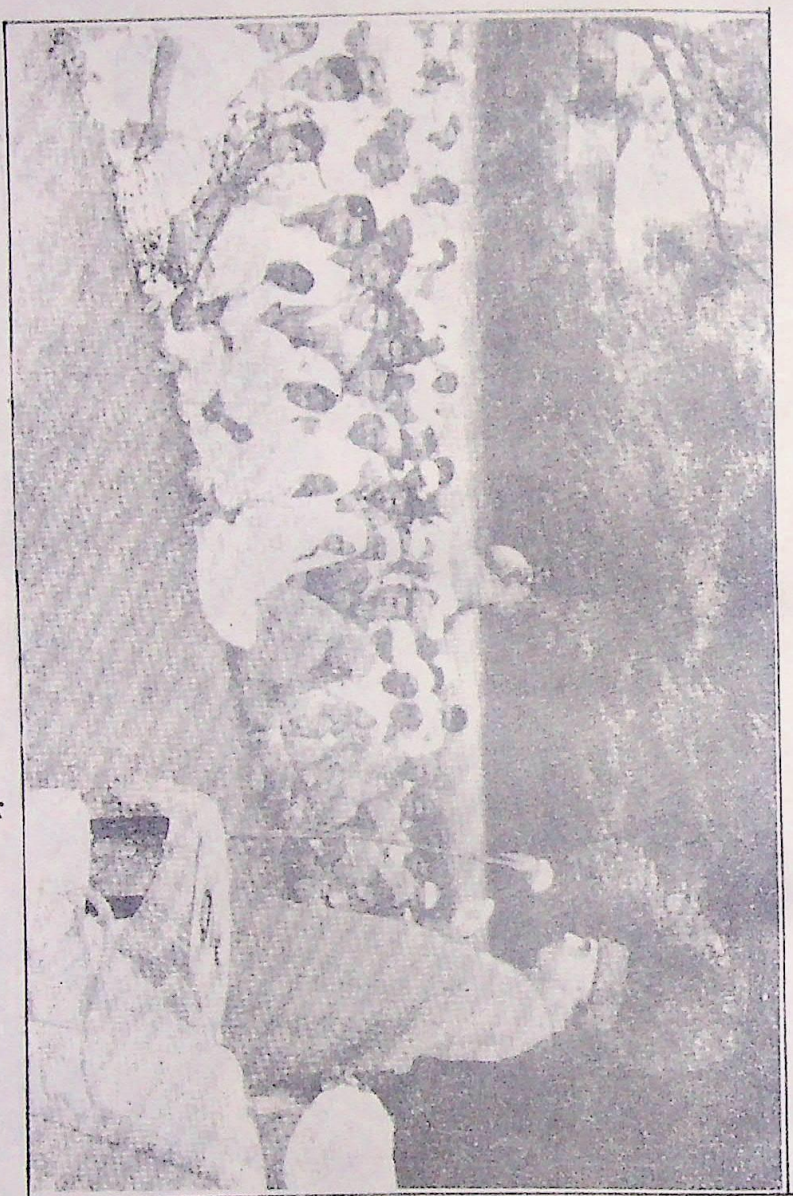
بخشی صاحب...... بے آسرا خواتین سے مخاطب

پیاری بہنو! تم وطن کی شوبھا ہو
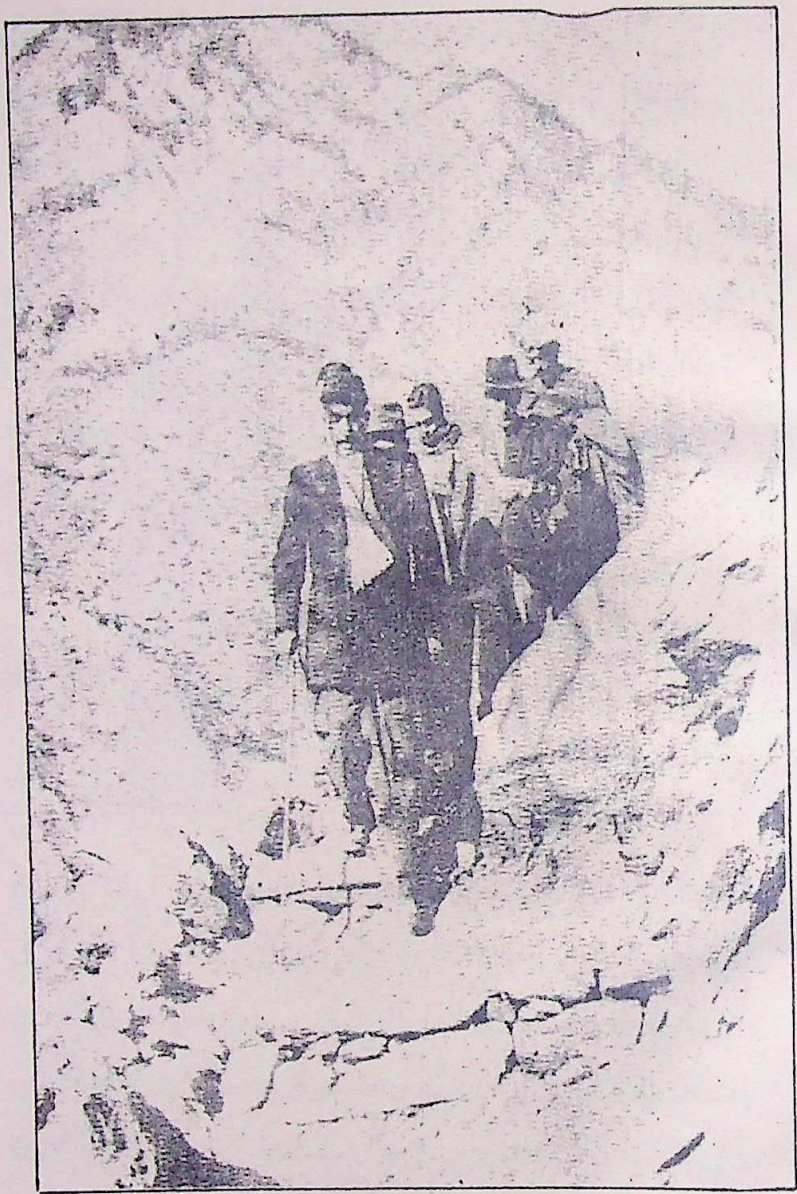
ناقابل رسائی پہاڑی علاقوں کا دورہ

بخشی صاحب - عوام سے خطاب

ہے کہ ہمیں کونسا راستہ اِختیار کرنا چاہئے۔ میں اِس کوشش میں لگا ہوں کہ گاندھی جی فوری طور پر کشمیر جائیں اور شیخ صاحب کو آزاد کرائیں۔ پاکستان ایک حقیقت بن کر سامنے آ رہا ہے۔ مہاراجہ اور اس کا وزیراعظم کاک اِنڈی پنڈنٹ رہنے کیلئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ کانگریسی، الحاق کشمیر کے حق میں ہیں۔ مسلم لیگی کشمیر کو باپ دادا کی جاگیر سمجھ رہے ہیں۔ آخر کریں تو کیا کریں، میں فریقین کو ٹال رہا ہوں۔ آخر کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی ہے۔ گاندھی جی کے کشمیر پدھارنے کے بعد یقینی طور پر لیڈروں اور کارکنوں کی رہائی کا فیصلہ ہوگا مگر ہمیں یہ زیرِ نظر رکھنا ہوگا کہ اگر مُلک مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہوا اور صوبہ سرحد جاتا رہا تو سینکڑوں میلوں کے سرحدوں کو دیکھ کر فیصلہ کرنا ہوگا ورنہ ہم ہمیشہ جنگ وجدل کے شِکار ہوں گے"۔ جب یہاں سرینگر میں مستقبل کے لائحہ عمل کا فیصلہ کیا گیا تھا اِس وقت بھی بخشی صاحب نظر تھے۔

جب ۱۹۴۷ء میں اعلان آزادی کے بعد ریاست میں ایمرجنسی حکومت قائم ہوئی اُس وقت لا اینڈ آرڈر کا تباہ شدہ نظام اور بھی درہم برہم ہو چکا تھا۔ یہ بخشی صاحب کا کمال تھا کہ آگ کے شعلوں اور خون کے دریاؤں میں صوبہ کشمیر کے تمام فرقوں میں امن وامان کی فضا قائم کی۔ جموں کے شرپسندوں کی سرکوبی کیلئے بخشی کا نام لیا گیا تو ایک بہادر سپاہی کی طرح اپنے جرنیل کا حکم قبول کیا۔ کسی کو یہ یقین نہ آتا تھا کہ بخشی جموں میں زندہ سلامت رہے گا مگر اس آہنی انسان نے وہ کر دکھایا جو اِنسانی فہم سے بالاتر تھا۔ یہ تو مسلمہ ہے کہ جموں کے قتل وغارت میں بڑے آدمیوں کا ہاتھ تھا لیکن بخشی صاحب نے تدبر سے اُن سب کا سر کچل کے رکھ دیا۔ کئی بار انہیں قاتلانہ حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دفعہ جب میر پور کے رفیوجی ہزاروں کی تعداد میں چھمب تک پہنچے۔ ان غریبوں کا سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ عزیز واقارب مارے گئے تھے، انتہائی

اشتعال میں تھے۔ اِسی دوران بخشی صاحب چھمب پہنچے۔ انہوں نے اُن سے خطاب کرنا چاہا مگر رفیوجیوں نے گالیوں کی بوچھاڑ شروع کی اور اُفسروں اور پولیس کی موجودگی میں ان کا گھیراؤ کیا گیا۔ قریب تھا کہ انہیں گولی کا نشانہ بنایا جاتا مگر بخشی صاحب نے حاضر دماغی اور دل جمعی کے ساتھ اچکن کے بٹن کھولے اور ایک نوجوان کو جو بندوق تھامے ٹریگر پر انگلی رکھ چکا تھا، مخاطب ہو کر کہا...... "میں تمہاری مدد کو آیا ہوں اگر تم لوگ مجھے مارنا چاہتے ہو تو بے شک گولی مار دو......" یہ سن کر مشتعل ہجوم کے جذبات ٹھنڈے ہوئے اور آگے بڑھنے سے رُک گئے۔ ایک دفعہ رات کی تاریکی میں بخشی صاحب کی رہائش گاہ پر فائرنگ ہوئی۔ ان کی جیپ پر بم پھینکا گیا مگر اُن کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ جموں کا معرکہ سر کیا اور پھر جب باضابطہ حکومت بنائی گئی تو شاید ان ہی قربانیوں کے اعتراف میں انہیں ڈپٹی پرائم منسٹر بنایا گیا۔ اُن پر کسی نے عنایت نہ کی بلکہ یہ ہر لحاظ سے اِس کے مستحق تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے ان کو شاندار خدمات کے صِلہ میں اپنی کار بطور انعام پیش کی۔

یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عوامی حکومت میں بخشی صاحب ڈپٹی پرائم منسٹر مقرر کئے جائیں گے۔ کیونکہ ان کے بہت سے ہم عصر ایسے تھے جو تعلیمی لحاظ سے بہت آگے تھے مگر لیڈر شپ نے اُن کی قابلیت و صلاحیت ہی کو مدِ نظر رکھا۔ بخشی صاحب چھ سال تک ڈپٹی پرائم منسٹری پر براجماں رہے۔ اِس دَور میں انہوں نے اپنی سرگرمی اور فعال شخصیت سے کافی نام پیدا کیا۔

۵۳ء کے اَوائل میں، میں اُن سے ملا تو مجھے وہ کچھ پریشان سے دکھائی دئے۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آخر کیا ہونے والا ہے جو وسیع پیمانے پر لا اینڈ آرڈر قائم رکھنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بخشی صاحب نے بحیثیتِ معتمد

دوست کے مجھے کہا کہ ایک انقلاب آنے والا ہے۔ آپ لوگوں کو سخت محنت کرنا پڑے گی۔ لیڈر شپ قول و قرار سے پھِر گئی ہے۔ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ خون کے دریا بہیں گے۔ سب یہ سب کچھ کسی قومی مفاد کی خاطر نہیں ہو رہا ہے بلکہ اِس میں صرف ذاتی اغراض پوشیدہ ہیں............ یہ کہتے ہوئے بخشی صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ پھر زور دے کر کہا کہ میں لوگوں کو بچانے کی خاطر جان کی بازی لگاؤں گا۔ اِس کے بعد ۹/ اگست ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہوا۔

اِبتدائی مرحلہ پر ۹/ اگست ۱۹۵۳ء میں افراتفری، قید و پابندی کے بھیانک واقعات تو ہوئے اور توقع سے زیادہ عوام کے جذبات اُبھرے مگر بخشی صاحب ثابت قدم رہے۔ یہاں تک کہ ایک انسانیت سوز واقعہ نے اُن کے پاؤں ڈگمگائے اور وہ مایوس ہونے لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت صادق صاحب آڑے آئے اور بخشی صاحب کو مخاطب ہو کر کہا کہ استحصالی عناصر کو ختم کرنے کیلئے اور انقلاب لانے کیلئے ٹینکیں، توپیں اور ہوائی جہاز استعمال کئے جاتے ہیں تم کیوں خواہ مخواہ عورتوں کی طرح رو رہے ہو۔ ہمت کرو اور دلیری سے کام جاری رکھو۔

راقم الحروف کو اُس وقت معلوم ہوا کہ نیشنل کانفرنس کا ایک خاص عنصر اُن کی پُشت پر تھا اور بخشی صاحب اکیلئے نہیں تھے۔ سال بھر میں انتظامی مشینری نے کَل پرزے ٹھیک کئے اور دہلی سے بھی کشمیریوں کی دِل جوئی اور تالیفِ قلوب کیلئے کافی اقدامات کئے گئے۔ اِس دوران خوش قسمت لوگوں نے تجوریاں بھر دیں۔ کئی لوگ جو کوڑی کو محتاج تھے، لکھ پتی بن گئے۔

●●●

انورؔ صابری

نذرِ خالدِ کشمیر

(بتقریبِ جشنِ ولادت)

عظمتِ ہندوستان کے پاسبان ہوش مند
آسماں گیر جہاں ہے تیرا عزم سر بلند

تیرا عنوان سفر ہے جادۂ حُسنِ عمل
زندگی تیری غنیؔ کی شاہکار، دل غزل

جنتِ کشمیر کے رنگیں نظر معمارِ نو
آفتابِ علم ودانش تیری پیشانی کی ضو

دانش اِمروز تیرے حلقہ برداروں میں ہے
ذکر تیرا محفل انجم کے سیاروں میں ہے

قلب نورالدین ولیؒ کا آئینہ تیری حیات
فکرِ انورؔ شاہؒ تیری آرزو کی کائنات

رُوحِ گاندھی ہر قدم تیرے اِرادوں کی مشیر
دیدہ آزاد سے تیری نگاہیں سیر

پاسبانِ عزت وتوقیر اِنسانی ہے تُو
پیکرِ عزم جواں تصویرِ قربانی ہے تو

ہر دل پر دردِ آدم کا شریکِ غم ہے تُو
زخم دل کا غربت وافلاس کے مرہم ہے تو

پڑھ کے ہر چہرہ کو سینے کی خبر لیتا ہے تُو
سازشِ دشمن سے بھی داد نظر لیتا ہے تو

عرش پر پہنچے نہ شالامار کا کیونکر دماغ
تازہ پانی میں کئے ماضی کے پھر روشن چراغ

یہ عوام الناس پر تیرا بڑا انعام ہے
چشمہ شاہی غریبوں کیلئے اَب عام ہے

ہر برس رنگینیٔ جشنِ بہاراں کی قسم
وادی کشمیر بن جاتی ہے گلزارِ ارم

جذبہ اخلاص خبر وربط باہم کردیا
ہند اور کشمیر کے رشتوں کو محکم کردیا

جاوداں یہ رنگ ہے خوش بختی احوال کا
ہے جواہر لال تیرا، تو جواہر لال کا

اَمن کے خوابوں کی یہ کتنی حسین تعبیر ہے
قسمت ہندوستان، کشمیر کی تقدیر ہے

کوئی اِس تعبیر کے خاکے مٹا سکتا نہیں
چشمِ بد میں کوئی اِس جانب اٹھا سکتا نہیں

روز اَفزوں سلسلہ ہو عمر خوش اقبال کا
ہر چوپن پر اضافہ ہو چوپن سال کا

جاوداں ہو تیرے گلزارِ تمنا کی بہار
زندگی کا ہر نفس ہر نغمہ ریز و عطر بار

کاش سرحد پار بھی جائے یہ سازِ دل کی لَے
ہر زباں پر خالدِ کشمیر زندہ باد ہے

☆☆☆
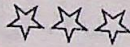
دورِ حاضر کا عظیم اِنسان

ٹیکساس کے شہر ابلینہ میں سماجی علوم کے میدان میں تحقیقات کا کام انجام دینے والے ایک عالم مسٹر کالون سی ، کاڈون نے ریاست جموں وکشمیر کے وزیراعظم جناب بخشی غلام محمد کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وزیراعظم جناب بخشی غلام محمد کے نام اُپنے ایک مکتوب میں مسٹر کالون لکھتے ہیں:

''میں اَپنی قوم کے ایک بہترین ہائی سکول میں سماجی تحقیق کا اُستاد ہوں۔ میرے خوش گوار اور صلہ بخش فرائض میں سے میرے ذمہ ایک کام یہ تفویض ہوا ہے کہ میں اپنے سکول کے طلباء کے سامنے آج کی دنیا کے رہنماؤں کی زندگی کے حالات اوران کے کارناموں کی روئیداد پیش کروں۔ جب میں اُپنے لیکچروں میں ان بے لوث، صادق اور خوش خلیق انسانوں کے کارہائے نمایاں اوران کی فکرانگیز زندگی کے حالات بیان کرتا ہوں جن پر ہماری دنیا کی رنگ برنگ کی قوموں کے بھاری معاملات نپٹانے کی بڑی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ تواِن موقعوں پر میں اَپنے آپ میں بڑی اُمنگ اور گرم جوشی محسوس کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اپنے سکول کے ایک ایک لڑکے میں بھی یہی جوش وجذبہ اور یہی سرگرمی پاتا ہوں۔

سماجی علوم کے مطالعہ کے دوران اس موضوع پر کوئی بات چھڑتی ہے تو ہم خاص طور

بخشی صاحب...... ننھے بچوں کی محفل میں

سکولی بچیوں کے ساتھ

سرینگر میں بچوں کا دِن

بخشی صاحب رسہ کشی کے مقابلے میں حصہ لے رہے ہیں

پر کشمیر کے قابل احترام، جفاکش اور سلیقہ شعار وزیراعظم جناب بخشی غلام محمد کی شخصیت اور زندگی سے تحریک لیتے ہیں اور اسکا مطالعہ کرنے میں بڑی سنجیدگی برتتے ہیں۔

اِس قوم کے نوجوان ایک عمدہ نظام حکومت، عالمی امن اور سمندر پار کے ملکوں میں رہنے والے اُپنے تمام دوستوں کی سلامتی اور ان کی بہبودی سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہی وہ قدریں ہیں جو بنائے رکھنے اور جنہیں تقویّت پہنچانے کیلیئے آپ نت نئی اور بیش بہا خدمات انجام دے رہے تھے اور اسی لئے میرے سب طالب علم آپ کی عزت کرتے ہیں اور آپ سے متاثر تھے۔ آپ سچّے معنوں میں اپنے ملک اور عوام کیلیئے گراں قدر خادم اور ممتاز شہری کی حیثیت رکھتے تھے۔

ایک عظیم قوم اور عظیم ملک کی امتیازی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ اِس میں ذہانت اور عظمت کے اِنسان خوشی خوشی اپنا سب کچھ اپنی قوم کیلیئے وقف کردینے کو تیار رہتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات میں مفاہمت کیلیئے اور حکومت کے دائرہ میں آپ جو شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں وہ ہمارے لئے فخر کا باعث ہیں۔ آپ کی ریاست ہماری دنیا کا ہی ایک حصّہ تو ہے۔ اِس طرح سے ساری دُنیا آپ کی صلاحیتوں اور ذہانت سے فیض پا رہی ہے۔ درس و تدریس کے پیشہ سے تعلّق رکھنے والے ہم لوگ بھی آپ کے عمدہ کام سے بے حد لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہم اِس سے ضرور باخبر ہیں کہ عظیم الشان کشمیر کے وزیراعظم کی حیثیت سے آپ کو کتنی اہم اور پیچیدہ ذمہ داریاں نبھانا پڑ رہی ہیں۔ ہم اِن تمام ترقیاتی کاموں کا غائر نظر سے جائزہ لے رہے ہیں جو آپ کے عظیم ملک میں عمل میں آ رہی ہیں۔

اگرچہ ہم آپ کی خدمات کی زبردست افادیت کا اندازہ کرسکتے ہیں اور اس کو پرکھ لیتے ہیں۔ تاہم میں نجی طور پر آپ تک شکریہ سے بھرپور اپنے جذبات

پہنچانے کا شاذونادر ہی کوئی موقع ملتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم پوری طرح سے یہ آنک نہ سکے ہوں کہ آپ کو اتنی خوبی کے ساتھ عوام کی خدمت اَنجام دینے کیلئے ذاتی طور پر کیا کیا قربانیاں دینی پڑی ہوں گی۔ اِس میں شک نہیں کہ ہم آپ سے متعلق ہر مضمون کا ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر بھی ہم یہ معلوم نہیں کرسکتے کہ آپ کشمیر میں عوام کے سود و بہبود کیلئے اور اِس طرح ہم سب کیلئے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کی خاطر وقت وقت پر کتنے کوشاں رہتے ہیں۔ کیا کیا منصوبے سوچتے ہیں، کتنا فکرمند ہوتے ہیں اور کتنی قوّت صرف کرتے ہیں۔ اِس مقصد کے حصول کیلئے آپ کو اب تک جو اَنتھک جدوجہد کرنا پڑی ہے ہم اِس کی ایک معمولی سی جھلک تو پا سکتے ہیں مگر اس سے زیادہ کی جانکاری حاصل نہیں کرسکے ہیں۔ بہرحال آپ کی خدمات میں کوئی کلام نہیں۔ ہم کس زبان سے آپ کا شکریہ اَدا کریں۔

میں ایک سیدھا سادہ سکول ٹیچر ہوں آپ اور میں آمنے سامنے شاید کبھی نہ مل سکے ہیں۔ لیکن میں ذاتی طور پر آپ کو اِن کارہائے نمایاں کیلئے، جو آپ دنیا کے بے شمار خوش خصال لوگوں کی خاطر اُنجام دے چکے ہیں اور جو آپ مستقبل میں انجام دینے جا رہے ہیں، دِلی شکریہ اَدا کرنا چاہتا ہوں۔ ہم ہمیشہ آپ کی سرفروشی، آپ کی اولوالعزمی، آپ کی بے خوفی اور مثالی کردار کے اِس انداز کو ہمیشہ یاد رکھیں گے جس کے طفیل آپ نے اَپنے کو اِتنے ممتاز مرتبہ تک پہنچا دیا ہے۔

اپنی عظیم شخصیت سے آپ نے ہمیں جو فیض عطا کئے ہیں اس کیلئے ہم شکرگذار اور احسان مند ہیں۔ جب تک مجھ میں دُوسروں کو تعلیم دینے کی قوّت رہے گی، میری کوشش یہی رہے گی کہ میں عزت مآب وزیرِاعظم جناب بخشی غلام محمد کی زندگی اور ان کے کاموں کی عظمت اپنے طلباء کے ذہن نشین کردوں۔ آپ جس

تعظیم وتکریم سے سرفراز ہیں، یقینی طور پر آپ اس سے کہیں زیادہ عزت افزائی اور قدر ومنزلت کے رُوادار ہیں۔ آپ کا نام زمانے کے ہر دَور میں زندہ اور تابندہ رہے گا۔ اگر میں اَپنے طلباء کو کوئی سبق دینے کی خواہش رکھتا ہوں تو وہ اِس حقیقت کا اظہار ہے کہ دنیا میں عظیم قوموں کی تعمیر تن آسان لوگوں نے نہیں کی۔ یہ قومیں عظیم اِنسانوں نے تعمیر کیں۔ ایسے انسانوں نے، جو عزمِ صمیم اور مدبرانہ بصیرت کے مالک تھے، قوموں کی تعمیر کا کام آج بھی جاری ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ وزیراعظم کی حیثیت میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور تدبر سے اپنے عوام کی آنے والی نسلوں کیلئے ایک آسودہ حال اور بہتر کشمیر کی تخلیق کر رہے ہیں۔

(ماخوذ)

ڈی۔این کاہن

نئے کشمیر کا معمار

بسا اوقات دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص اقتدار کی کرسی حاصل کرتا ہے تو وہ اپنی پرانی شخصیت کو سرے سے ہی بھول جاتا ہے۔ نہ صرف اس کا چہرہ بلکہ اس کے عادات بھی بدل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے دوستوں کو بھی اس کے ظاہری رکھ رکھاؤ اور جھوٹے وقار کا مجبوراً ساتھ دینا پڑتا ہے۔ لیکن ایسے بھی لوگ ہیں جو اقتدار کی کرسی سے وابستہ رسموں کو تکلیف دہ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ اپنے اصلی رنگ و روپ کو خیر باد نہیں کہنا چاہتے۔ اسی قسم کے افراد کے زمرہ میں ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد بھی شامل تھے۔

یہ بات نہیں کہ جناب بخشی غلام محمد کا رسمی تقریبوں کے ساتھ واسطہ نہیں رہا ہے یا وہ سرکاری کاموں سے غیر مانوس ہیں۔ جب وہ کشمیر کی کابینہ میں شامل ہوئے وہ ایسے طور طریقے سے اپنا کام چلاتے رہے کہ تجربہ کار سیاست دان بھی اس پر رشک کرنے لگے۔ جب ہم یہ بات زیر نظر رکھیں کہ آزادی سے پہلے کشمیر کی حالت کیا تھی اور اس ریاست کے سیاسی کارکنوں کو کس کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے تو بخشی صاحب کی شخصیت زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔

بخشی صاحب کو اپنی جوانی کے دنوں میں سیاست نے اپنی طرف کھینچ لیا۔

انہیں سیاسی شغل کا اتنا زیادہ شوق نہ تھا جتنا کہ ان میں قومی پرستی کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ ابھی بیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ گاندھی جی ملک کیلئے کیا کچھ کررہے ہیں۔ ایک ایسی ریاست میں جہاں ایک شخصی حکمران کی حکومت تھی اور وہ بھی برطانوی حکومت کے زیرِ نگیں...... بخشی صاحب نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ سرینگر کے کھادی بھنڈار میں شامل ہو جائیں۔ وہ گاندھی ٹوپی کے ساتھ کھادی بھی پہننے لگے اور جلدی ہی وہ بخشی غلام محمد گاندھی کے نام سے پکارے جانے لگے۔ گاندھی کا لفظ اب انکے نام کے ساتھ وابستہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ آج سے چند سال پہلے جب وہ آئین ساز اسمبلی میں نیشنل کانفرنس کی شاندار فتح کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی سرحد پر واقع سانبہ کے چھوٹے قصبہ میں گئے تو وہاں ان کا زندہ باد کے نعروں کے ساتھ استقبال نہیں کیا گیا بلکہ جب وہ اِس قصبہ، جس کی آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے، کے بازاروں میں سے گزُرے تو مقامی باشندوں نے ان کا بخشی غلام محمد گاندھی کی جَے، کے نعروں سے سواگت کیا۔

قبائلی حملے کے دوران بخشی صاحب ہندفوج کے ساتھ ساتھ رہے اور جہاں جہاں جاسکتے محاذ جنگ پر موجود رہتے۔ یہ اُنہی دنوں کی بات ہے بخشی صاحب نے ہندفوج کے اعلیٰ جرنیلوں کے ساتھ دائمی دوستی پیدا کرلی۔ ریاست جموں وکشمیر کے بعض باشندوں نے بھی اِسی طرح فوج اوراس کے افسروں کے ساتھ دوستی قائم کرلی۔

جولوگ بخشی صاحب کے سیکولر نظریات اور پاکستان کی دوقومی نظریہ کی شدید مخالفت سے واقف ہیں وہ ہرگز تعجب کا اظہار نہیں کرتے۔ جب بخشی صاحب اعلان کرتے ہیں کہ کشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق حتمی اور ناقابل تنسیخ ہے۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اپنی پالیسی اس وقت طے کی تھی جب کہ

پاکستان ابھی معرض وجود میں ہی نہیں آیا تھا۔ ۱۹۳۸ء سے لیکر ہی کشمیر نیشنل کانفرنس ایک غیر فرقہ وارانہ اور قومی جماعت چلی آئی ہے۔ کانفرنس کے لیڈروں کا کانگریس کے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ اس سے بھی بڑھکر تعلق خان عبدالغفار خان اور خدائی خدمتگار تحریک کے ساتھ رہا ہے

بخشی صاحب اُن دِنوں کو بھول نہیں گئے ہیں جب ۱۹۴۶ء میں شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے بعد انہوں نے ایک بہت بڑا وقت کشمیر کے باہر گزارا تھا اور ان کے بعض ساتھی مالی اور دیگر ذرائع کے بغیر 'کوِیٹ کشمیر' تحریک کی حمایت کیلئے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر ایک شہر کے بعد دُوسرے شہر میں پِھرتے رہے۔ دہلی میں وہ پہاڑ گنج میں رہا کرتے تھے اور وہ کانگریسی لیڈروں سے ملتے رہتے ۔ اخباروں کے دفتروں میں جاتے رہے تا کہ تحریک کی اہمیت پوری طرح سے واضح کی جاسکے ۔ انہی دنوں وہ گاندھی جی سے ملنے سیوا گرام گئے اور وہاں ان کے سامنے کشمیر کے مسئلہ کی وضاحت کی۔

وزارت اعظمیٰ سنبھالنے کے بعد بخشی صاحب اُپنی انتظامی قابلیت کا اظہار تعمیری کاموں میں کرتے رہے ہیں۔ ریاست کی تاریخ میں صدیوں کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے کہ ریاست معاشی اور صنعتی ترقی کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ بانہال پہاڑ میں نئی سُرنگ بچھانے کی تجویز جو سالہا سال تک محض تخیّل بن کر رہ گیا تھا عملی صورت اختیار کرگئی۔ سرینگر کو سیلابوں سے بچانے کا کام شروع کیا جاچکا ہے۔ کسانوں اور کاشت کاروں کو مجوزہ اور دیگر سختیوں سے آزاد کرانے کا کام شروع کیا گیا۔ رشوت ستانی جو ریاست میں زندگی کا ایک جزو بن گئی تھی کا قلع قمع کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ نظم و نسق کو نئے سرے سے منظم کیا گیا ہے۔

یہ کام کسی بھی صورت میں معمولی نہیں۔ یہ ایک عظیم کام تھا لیکن جناب بخشی غلام محمد نہ صرف ایک بہادر سیاست داں بلکہ ایک بے خوف اور دُور اندیش منتظم بھی تھے۔ بعض اشخاص ان سے ڈرتے بھی تھے۔ لیکن عام لوگ ان سے محبت بھی رکھتے تھے۔ جو لوگ ان سے ڈرتے تھے اِن میں سیاسی شاطر شامل ہیں لیکن جب عام لوگ انہیں کسی جگہ دیکھتے تو مسرّت اور خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ سرینگر میں وہ ہفتہ میں دُو بار 'کھلا دربار' منعقد کرتے۔ کوئی بھی شخص اِس دربار میں جاکر ذاتی طور اُن کے سامنے شکایت پیش کر سکتا تھا۔ مختلف محکموں کے افسران کے پاس ہی ہوتے تھے اور وہ موقعہ پر انہیں ہدایات دیتے تھے۔ لیکن اگر شکایت کا تعلق کسی قصبہ یا گاؤں کے ساتھ ہو تو وہ ٹیلیفون پر ہدایات دیتے تھے۔

بخشی صاحب سُرخ فیتے اور دفتری طوالت کو برداشت نہیں کرتے۔ بہت برس پہلے جب سرینگر کی تنگ سڑکوں میں حادثات کی متعدد وارداتیں ہوئیں تو انہوں نے میونسپلٹی حکام، انجینئروں اور اہلکاروں کو طلب کیا اور خود موقع پر گئے۔ صرف چند دنوں میں سڑکیں کشادہ کی گئیں۔ جن مکانوں کو گرایا جانا تھا، ان کے مالکوں کو موقع پر ہی معاوضہ دیا گیا اور اُسی وقت انہیں متبادل زمین دی گئی۔ بخشی صاحب ہر روز صبح موقعہ پر موجود ہوتے۔ انہی طریقوں پر عمل کر کے انہوں نے چرارِ شریف کی زیارت اور حبہ خاتون کے مزار کو نئی شکل وصورت دے دی اور جب کبھی کوئی ہنگامی مرحلہ در پیش آجاتا تو اِنہی طریقوں پر عمل ہوتا دیکھا جاتا۔ سیلاب آجائے تو بخشی صاحب کو کسی سیلاب زدہ علاقے میں لوگوں کو بچانے کے کام میں اور ان کا حوصلہ بڑھانے کے کام میں مصروف پایا جاتا۔ کہیں آگ لگ جائے بخشی صاحب ان لوگوں میں سے ہوں گے جو سب سے پہلے موقع پر حاضر پائے جائیں گے۔

اکثر باعمل انسانوں کی طرح وہ موسیقی اور شاعری کے دِلدادہ تھے۔ وہ کشمیری شاعری کے بڑے شوقین تھے۔ جب تک جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم نہ بنے تھے وہ عموماً موسیقی کی محفل منعقد کیا کرتے تھے۔ جناب بخشی صاحب کشمیر کی موسیقی کو بے حد پسند کرتے تھے اور وہ کشمیری لوک گیتوں کو سُن کر ہرگز تنگ نہیں ہوتے لیکن نئی ذمہ داریوں نے اُن کا وقت اُن سے چھین لیا تھا اور وہ موسیقی سننے کیلئے بمشکل وقت نکال سکتے تھے۔ وہ ریاست کی ترقی اور تعمیر کے کاموں میں اِس قدر مصروف رہتے تھے کہ اُن کے کہنے کے مطابق انہیں اگست ۱۹۵۳ء کے بعد سے لے کر ۱۹۷۰ء تک موسیقی سے دِل بہلانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

بخشی صاحب بلند ہمت آدمی تھے اور وہ وفاداری کے معاملے میں بڑے سخت جان واقع ہوئے تھے۔ جن لوگوں نے تحریک اور جدوجہد آزادی کے دوران انحراف کیا۔ انہیں بخشی صاحب نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ لیکن وہ ان کے ساتھ بھی اپنی غیر رسمی دوستی قائم رکھے ہوئے تھے۔

بخشی صاحب اپنے بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ ساتھ ہی ایک تابعدار بیٹے کی بہترین مثال پیش کرتے تھے۔

بخشی صاحب کا کل ہند اِسٹیج پر ظہور سب سے پہلے کلیانی (بنگال) میں ہوا۔ جہاں ۱۹۵۳ء میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اُودھی مدراس میں بھی انہوں نے خوبی اور کامیابی کے ساتھ اپنی وقعت میں اضافہ کیا۔ وہاں آپ نے اپنی تقریر میں جنوبی ہند میں رہنے والے لوگوں پر واضح کیا کہ اگر انہوں نے مسئلہ کشمیر کو نظر انداز کیا تو اس کے کیا نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

ایک طاقت ور اور مؤثر شخصیت ہونے کے باعث وہ دشمنوں اور نکتہ چینیوں

کے بغیر نہیں۔ خواہ وہ ریاست کے اندر ہوں یا باہر۔ ان پر جو الزامات عائد کئے جاتے تھے ان کی فہرست بھی لمبی چوڑی تھی۔ لیکن اُن کا بدترین دشمن بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جب سے انہوں نے وزارت اعظمی کی کرسی سنبھالی، انہوں نے ریاست کی کشتی کو استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے کی طرف چلایا ہے اور غیر یقنیت اور بے چینی کا خاتمہ کر دیا۔ اُنہوں نے لوگوں میں اُمید کی نئی رُوح پھونک دی اور انہیں تحفّظ اور استحکام کے بارے میں کئی قسم کے شکوک وشبہات کے بغیر ترّقی کرنے کا احساس دلایا۔ اُن کی بدنامی کرنے والے بھی کئی ایک پائے جاتے تھے لیکن ہزاروں اشخاص جو اُن دنوں کشمیر آئے بچشم خود دیکھا کہ نئے وزیر اعظم کی قیادت میں ریاست کیسی تیز رفتاری کے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔

(ماخوذ)
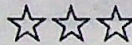
خالدِ کشمیر......

اکابرینِ سیاست وصحافت کی نظر میں

میں اِس ہمہ گیر ترقی سے کافی متاثر ہُوا ہُوں جو ریاست نے کی ہے اور اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم بخشی غلام محمد کی رنگارنگ شخصیت نے بھی مجھے کافی متاثر کیا ہے۔ کشمیر نے ہمارے دِلوں کو جیت لیا ہے اور اِس جیت میں ان کا (بخشی صاحب) کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔

(ڈاکٹر ہیمر شولڈ، سیکرٹری جنرل۔ اقوام متحدہ)

بخشی غلام محمد جموں و کشمیر کی نئی تقدیر کے ایک عظیم معمار ہیں۔ انہوں نے ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی دُرست رہنمائی کی ہے جو ترقی کی منزلیں سُرعت سے طے کر رہے ہیں۔

(بی، آر بھگت، ڈپٹی فائنانس منسٹر آف انڈیا)

وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد نہ صرف ریاستی عوام کیلئے بلکہ تمام ہندوستان کیلئے توانائی کے ایک مینار اور فیض کے ایک بے پایاں مخزن کی حیثیت رکھتے ہیں۔
بخشی صاحب نے پاکستانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کیلئے نہتے کشمیریوں

کی جس ہمت کے ساتھ قیادت کی وہ تاریخ کا ایک سُنہری باب ہے۔

بخشی صاحب کی عظیم قیادت میں ریاستی حکومت نے تعلیمی ترقی کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

(ڈاکٹر رگھبیر۔ ممبر پارلیمنٹ)

میرے کشمیر کے دَورے کا شاید سب سے نمایاں تاثر یہ ہے کہ بخشی غلام محمد ان کشمیری بادشاہوں کی طرح ایک معمار کی حیثیت سے اُبھرے ہیں جنہوں نے مختلف تعمیرات کی صورت میں تاریخ پر اَپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ ۱۹۵۳ء کے بعد تعمیراتی سرگرمیوں کی وجہ سے وادی کا حلیہ ہی بَدل گیا ہے۔

(درگا داس۔ چیف ایڈیٹر ہندوستان ٹائمز)

بخشی غلام محمد شہریوں کے لباس میں سب سے بڑے سپاہی ہیں۔ ہم صرف اِس لئے ہی ان کو محبّت کی نظروں سے نہیں دیکھتے کہ کشمیر کے معرکوں میں وہ بڑی جرأت سے خندق خندق جا کر گھومتے رہے۔ بلکہ اِس لئے بھی کہ وہ اِس سادہ مگر دلکش شخصیت کے مالک ہیں جس کو سپاہی سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ حکومت کے اور بہت سے معاملات میں غیر معمولی مصروفیت کے باوجود یہ ممتاز رہنما اور نئے ہندوستان کا معمار فوجوں کی بہبودی کی طرف متوجّہ ہونے کیلئے وقت نکال ہی لیتا ہے۔ جہاں کہیں بھی سپاہیوں کے درمیان اُن کا گزر ہوتا ہے وہ اَپنی عظیم شخصیت کا پَرتو چھوڑتے ہیں اور وہ انہیں اَپنا مفکر، دوست اور رہبر خیال کرتے ہیں۔

(سردار سرجیت سنگھ مجیٹھا۔ ڈپٹی ڈیفنس منسٹر آف انڈیا)

بخشی صاحب کے عزم، اُن کی توانائی اور عوامی بہبود سے متعلق ان کی زبردست دلچسپی کا ریاست کے تمام حلقوں میں اعتراف کیا جاتا ہے اور اس بات پر

سب کا اِتّفاق ہے کہ اُن کی حکومت تمام شعبوں میں ترّقی اور عوام کو خوشحال بنانے کیلئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے گی۔ اُن کی حکومت نے اقتصادی سدھار کیلئے جو اِقدامات کئے ہیں اس سے شہر اور دیہات میں رہنے والے لوگوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔

(ہردے ناتھ کنزرو، ممبر پارلیمنٹ)

جب میں نے وزیر اعظم بخشی غلام محمد کے ہمراہ وادی کشمیر کا دورہ کیا تو مجھے اِس بات کا اندازہ ہوا کہ کشمیر کس قدر ترقی کر چکا ہے۔

وزیر اعظم کسی حفاظتی پہرے کے بغیر عوام میں گھومتے رہے اور وہ انہیں پھول مالاؤں سے لادتے رہے۔ دہقانی عورتیں ان پر شیرینی کی بارش کرتی رہیں جو ایک بہترین استقبال کی علامت تھا۔ چاروں طرف 'وزیر اعظم زندہ باد' کے نعرے گونجتے رہے اور دہقان زادیاں پکارتی رہیں۔ 'ہمارا بخشی صاحب آ گیا ہے'۔

(نمائندہ سنڈے ٹائمنز، لندن)

یہ بخشی غلام محمد کے عملی تدبّر اور اُن کی عظیم شخصیت کا ہی فیض ہے کہ مجوزہ کے جبری طریقے کو ختم کیا گیا، جس کی وجہ سے سالہا سال سے کشمیری کسانوں کی بُری حالت ہو گئی تھی۔ بخشی صاحب کے دَورِ حکومت میں پہلی بار کسان حقیقی معنوں میں اپنی پیداوار کا خود مالک بنا۔ اِن کی دُور اندیش حکمتِ عملی کی وجہ سے کشمیری کسان میں خود اعتمادی کا وہ جوہر پیدا ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے کئی ایسے کارنامے انجام پذیر ہوئے ہیں جس سے ہم سب انگشت بدندان رہ گئے ہیں۔

(پنجاب راؤ دیش مکھ، مرکزی وزیر زراعت)

کشمیر پر شگفتگی چھا رہی ہے۔ کسانوں کو اِس قدر اعانت کبھی نہیں حاصل

ہوئی ہے۔ تعلیم پر ۴۸۔۱۹۴۷ء سے کئی گنا زیادہ خرچ کیا جارہا ہے۔ ہر جگہ نئے سکول، نئی سڑکیں، نئے شفاخانے، آبپاشی کے نئے وسائل اور برقی کی نئی لائنیں مشاہدے میں آتی ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کشمیر میں ترقّی اُوپر سے مسلط نہیں کی جاتی بلکہ اِس کیلئے نچلی صفوں سے باقاعدہ مطالبے ہوتے ہیں۔ جب وزیراعظم کسی گاؤں کے دورے پر جاتے ہیں تو انہیں دیہاتی بے تکلف انداز میں بتاتے ہیں کہ انہیں ایک مدرسۂ نسواں، ایک سڑک یا ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے اور جب وہ ایک مرتبہ وَعدہ کرلیتے ہیں تو اس کے ایفا میں دیر نہیں لگتی۔ یہ شگفتگی سیاسی استحکام کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتی تھی۔

(اِکانومسٹ، لندن)